ZEENAT SAJIDA KI INSHAIYA NIGARI

Dissertation

A Dissertation submitted to the University of Hyderabad, in partial fulfilment of the requirements for the award of the degree of

Master of Philosophy

in URDU

Submitted by

Umme Sulaim

M.A

Under the Supervision of

Dr.Arshia Jabeen

Associate Professor, Department of Urdu

Department of Urdu

School of Humanities, University of Hyderabad

Hydearbad-46

DECLARATION

I,***Umme Sulaim*** hereby declare that this Dissertation entitled ***"Zeenat Sajida Ki Inshaiya Nigari"*** submitted by me under the guidance and supervision of ***Dr.ARSHIA JABEEN*** is a bonafide research work which is also free from plagiarism. I also declare that it has not been submitted previously in part or full to this University or any other University or Institution for the award of any Degree or Diploma. I hereby agree that any dissertation can be deposited in Shodhganga/INFLIBNET.

Date: Name**: Umme Sulaim**

Signature of the Student

Reg. No:.**17HUHL06**

(Signature of the Supervisor) (Counter Signature)

Department of Urdu

School of Humanities,

University of Hyderabad.

Hydearbad-500046

Date:……………….

CERTIFICATE

This is certify that dissertation entitled ***“Zeenat Sajida Ki Inshaiya Nigari”*** submitted by ***Umme Sulaim*** bearing Reg.No. **17HUHL06** in partial fulfilment of the requirements for the award of degree ***Master of Philosophy in Urdu*** is bonafide work carried out by him under my supervision and guidance.

This dissertation has not been submitted previously in part or full to this or any other university or Institution for the award of any Degree or Diploma.

(Signature of the Supervisor)

Dr.Arshia Jabeen

Head Department of Urdu

Dean School of Humanities

Counter Signature

Department of Urdu

School of Humanities

University of Hyderabad

Hyderabad

This is to certify dissertation entitled ***ZEENAT SAJIDA KI INSHAIYA NIGARI*** submitted by ***Ms. Umme Sulaim*** bearing Registration No.***17HUHL06*** in partial fulfilment of the requirement for award for Master of Philosophy in the School of Humanities in a bonafide work carried out by him under my supervision and guidance.

This dissertation is free from plagiarism and has not been submitted previously in part or full to this or any other University or Institution for award of any degree or diploma.

Part of this dissertation have been presented in the following conference:

1. **“Zeenat Sajida Ki Inshaiya Nigari”** Presented in “Two Days National Seminar on 25^{th} & 26^{th} Oct 2018. (Copy of Certificate Enclosed)

Supervisor Supervisor Head of the Department

Dean of School

زینت ساجدہ کی انشائیہ نگاری

مقالہ

برائے ایم۔فل (اردو)

۲۰۱۸ء

مقالہ نگار

اُمِّ سُلیم

ایم۔اے

نگراں

ڈاکٹر عرشیہ جبین

ایسوسیٹ پروفیسر، شعبہ اردو

شعبہ اردو، اسکول آف ہیومانیٹیز

یونیورسٹی آف حیدرآباد

حیدرآباد۔۴۶

فہرست

پیش لفظ 2

باب اوّل

زینت ساجدہ کے سوانحی حالات اور شخصیت 6

(الف) سوانحی حالات

(ب) شخصیت

باب دوم

زینت ساجدہ کی معاصر خواتین قلمکار 49

(حیدر آباد دکن کے حوالے سے)

باب سوم

زینت ساجدہ کے انشائیوں کا تنقیدی مطالعہ 76

مجموعی جائزہ 163

کتابیات 172

پیش لفظ

میں اللہ رب العالمین کی بے پناہ شکر گزار ہوں کہ اس نے مجھے علماء اور ادباء کی سرزمین میں پیدا کیا۔ سرزمین مئو دینی وعصری علوم کے گہوارے کی حیثیت سے پورے ملک میں اپنی ایک منفرد پہچان رکھتی ہے۔ اس زمین نے بڑی بڑی ادبی وعلمی شخصیتوں کو جنم دیا ہے۔ یہاں کی علمی وادبی فضا میری شخصیت پر بھی اثر انداز ہوئی جس کے نتیجے میں آج میں تعلیم کے میدان میں اس مقام پر ہوں اور اپنا ایم۔ فل کا تحقیقی مقالہ داخل کر رہی ہوں۔

بیسویں صدی کے انشائیہ نگاروں نے فکر وفن کے دائرے کو وسعت عطا کی ہے۔ ویسے بھی انشائیہ کو ذہنی ترنگ کہا جاتا ہے جس کی اساس آزاد خیالی پر مبنی ہوتی ہے۔ بیسویں صدی کے حالات نے انشا پردازوں کو فکر واحتساب کا ایک موقع فراہم کیا اور اس دور کے انشائیہ نگاروں نے اپنی فطری صلاحیتوں کو اس صنف کی بدولت منظر عام پر لایا جس کے نتیجے میں منفرد اسالیب اور انشائی تحریروں کے نئے نئے نمونے منظر عام پر آئے۔

زینت ساجدہ بیسویں صدی کی خواتین قلم کاروں میں ایک اہم مقام رکھتی ہیں۔ انہوں نے افسانے، انشائیے، خاکے اور تحقیقی وتنقیدی مضامین وغیرہ لکھے ہیں۔ لیکن انہوں نے بحیثیت انشا پرداز، محقق اور ناقد بہت شہرت ومقبولیت حاصل کی۔ انہوں نے اپنے ادبی دور کا آغاز افسانہ نگاری سے کیا تھا لیکن بعد میں انہوں نے اپنی توجہ انشائیے کی طرف بھی مبذول کی اور ایک منفرد اسلوب اختیار کرتے ہوئے بہت سارے انشائیے لکھ ڈالے۔ انہوں نے عورتوں کی بدحال زندگی اور سماج میں رائج فرسودہ روایات کی خرابیوں کو انشائیوں کا موضوع بنایا ہے جو ان کی تحریروں میں صاف صاف نظر آتا ہے۔ اسی حوالے سے میری نگراں نے مجھے زینت ساجدہ کی انشائیہ نگاری پر کام کرنے کا مشورہ دیا۔ صدر شعبہ اردو اور دیگر اساتذہ کی منظوری کے بعد میری تحقیق کا موضوع ''زینت ساجدہ کی انشائیہ نگاری'' طے پایا۔

یہ مقالہ تین ابواب میں منقسم ہے۔

باب اول ''زینت ساجدہ کی حالات زندگی اور شخصیت'' کے عنوان کے تحت ہے۔اس باب میں زینت ساجدہ کے آبا و اجداد، ولادت، تعلیم و تربیت، شادی، اولاد، بیماری اور انتقال کے بارے میں معلومات فراہم کرتے ہوئے ان کی شخصیت کے مختلف گوشوں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

باب دوم میں ''زینت ساجدہ کی معاصر خواتین قلم کار حیدرآباد دکن کے حوالے سے'' کے تحت ہے۔اس باب میں حیدرآباد کی ان خواتین قلم کاروں کا تعارف دیا گیا ہے جن کا تعلق اس عہد سے رہا ہے تاکہ اس عہد کی لکھنے والی خواتین قلم کاروں کے بارے میں اختصار کے ساتھ معلومات حاصل ہوجائیں۔ان خواتین قلم کاروں میں سیدہ جعفر، جیلانی بانو، رفیعہ سلطانہ، نجمہ نکہت، بانو طاہرہ سعید، رفیعہ منظورالامین، عفت موہانی، آمنہ ابوالحسن، ثمینہ شوکت اور اشرف رفیع وغیرہ اہمیت رکھتی ہیں۔

تیسرا باب ''زینت ساجدہ کے انشائیوں کا تنقیدی مطالعہ'' کے عنوان سے رکھا گیا ہے۔اس باب میں انشائیہ کے فنی اجزا کے اعتبار سے زینت ساجدہ کے انشائیوں کا تنقیدی مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔آخر میں اختتامیہ ہے۔

شکریہ کے فرائض میں سب سے پہلے میں اللہ رب العالمین کی بارگاہ میں ہدیہ تشکر پیش کرتی ہوں جس کی بے پناہ نوازشوں اور عنایتوں سے میرا یہ تحقیقی کام پایہ تکمیل تک پہونچا۔اس کے بعد میں اپنے مشفق والد جناب اشتیاق احمد صاحب اور پیاری ماں رخسانہ خاتون کا شکریہ ادا کرنا اپنا اخلاقی و دینی فریضہ سمجھتی ہوں جن کی حوصلہ افزائی اور نیک خواہشات نے میری تعلیمی راہ کو ہموار کیا اور نہایت ہی محبت وشفقت سے مجھے پڑھایا جس کی بدولت میں آج اس مقام پر پہونچ پائی ہوں۔اللہ رب العالمین سے دعا گو ہوں کہ وہ میرے والدین کو عزت وصحت کی دولت سے نوازے اور ان کا مشفقانہ سایہ مجھ پر ہمیشہ برقرار رکھے۔اس کے علاوہ میں اپنے بھائی محمد شاداور اپنی پیاری بہنوں اُمِّ کلثوم، اُمِّ صدف، اور اُمِّ ایمن کی بھی شکر گزار ہوں کہ انہوں نے میری ہر لمحہ حوصلہ افزائی کی۔ساتھ ہی ساتھ میں اپنے نانا (سرفراز احمد مرحوم) کا بھی صمیم قلب سے شکریہ ادا کرتی ہوں جن کی شفقتیں اور دعائیں ہمیشہ میرے ساتھ رہیں اور دعا گو ہوں کہ

اللہ رب العالمین ان کو جنت میں بلند مرتبہ عطا فرمائے۔

میں اپنی نگران ڈاکٹر عرشیہ جبین صاحبہ کی بے حد ممنون و مشکور ہوں جنہوں نے بحیثیت نگراں اس مقالہ کی ترتیب و تنظیم میں میری بھرپور مدد کی اور ساتھ ہی ساتھ اس مقالہ کو لفظ بہ لفظ پڑھا اور ہر مشکل عمل میں میری رہنمائی اور حوصلہ افزائی فرمائی۔ دوران تحقیق ان کی شفقت و محبت اور ہمدردانہ ومخلصانہ رویہ ہمیشہ میرے ساتھ رہا ہے جس کو میں بیش قیمتی سرمایہ سمجھتی ہوں۔ انہوں نے مواد کی فراہمی اور تحقیق کے ہر مرحلے میں میری ہر ممکن تعاون اور رہنمائی کی۔ ان کی بے پناہ شفقت و محبت اور تعاون کو شاید میرے یہ رسمی الفاظ ان کا شکریہ کے حق کو ادا کرنے سے قاصر ہیں۔

میں اپنے شعبہ کے صدر پروفیسر حبیب نثار کی بھی شکرگزار ہوں جنہوں نے وقتاً فوقتاً اپنے مفید علمی مشوروں سے نوازا۔ اس کے علاوہ میں شعبہ کے دیگر اساتذہ کرام پروفیسر فضل اللہ مکرم، ڈاکٹر عبدالرب منظر، ڈاکٹر کاشف، ڈاکٹر زاہد الحق، ڈاکٹر نشاط احمد اور ڈاکٹر رفیعہ بیگم کا بھی تہہ دل سے شکریہ ادا کرتی ہوں جنہوں نے دوران تحقیق اپنے مفید مشوروں سے نوازا۔

میں اپنے شعبہ کے سابق صدر پروفیسر بیگ احساس کی بھی تہہ دل سے شکرگزار ہوں جنہوں نے دوران تدریس طریقہ تحقیق کے حوالے سے مفید معلومات فراہم کی اور اپنے تدریسی تجربات سے نوازا۔ اس کے علاوہ میں اپنے دوستوں کی بھی شکرگزار ہوں کہ انہوں نے میرے تحقیقی کام میں تعاون فرمایا۔

شکریہ

اُمِ سُلیم

۲۱۰۸

باب اوّل

زینت ساجدہ کے سوانحی حالات اور شخصیت

(الف) سوانحی حالات

(ب) شخصیت

زینت ساجدہ کے سوانحی حالات

آبا و اجداد

زینت ساجدہ کے اجداد کا تعلق صوفیا خاندان سے رہا ہے۔ان کا ننہالی سلسلہ قاضی محمود بحری سے ملتا ہے جو بیجاپور کے شرفاء اور سادات گھرانے کے محترم بزرگ تھے۔جن کی مقبولیت ادب کی دنیا میں ان کی مثنوی ''من گن'' سے ہے۔جو تاریخ اردو ادب کا ایک اہم کارنامہ ہے۔زینت ساجدہ کے نانا سید احمد قادری المعروف ''بہ گل امین'' معزز و باوقار افراد کی حیثیت سے شمار کئے جاتے تھے۔ ان کے والد مولوی سید قادری سبز پوش انعامدار ''خاندان نور دریا'' سے ددھیالی رشتہ رکھتے تھے۔یہ خاندان بغداد کے قریب ایک مقام ''مقلم حما'' میں بسا ہوا تھا اور اس خاندان کے افراد کو سادات حموی کے نام سے بھی جانا جاتا تھا۔ اس گھرانے نے پند و موعظت، رشد و ہدایت، پیری و مرشدی کو اپنا شعار سمجھا۔سترہویں صدی عیسوی میں اس خاندان کے کچھ افراد گلبرگہ منتقل ہوئے اور یہی پر سکونت اختیار کر لی۔زینت ساجدہ ننھیالی اور ددھیالی دونوں رشتوں سے سادات تھیں۔

مذہب یا مذہبی اقدار کے فروغ اور لوگوں تک اس کی رسائی کے لیے صوفیائے کرام نے جو طریقہ اختیار کیا اس نے خانقاہی نظام کو بلندی عطا کی۔صوفیاء نے مقامی بولی اور عام فہم زبان کا استعمال کر کے دکن میں اسلام کی اشاعت کی اور ان صوفیائے کرام کی ملفوظات اور ان کی تحریروں نے اردو کے آغاز کے سلسلے میں گمشدہ کڑیوں کو ملانے میں مدد کی۔گلبرگہ کے اطراف و اکناف میں'' خاندان نور دریا'' یا ''سادات حموی'' نے بھی اسلام کی اشاعت میں ایک خاص کردار نبھایا۔

احمد شاہ ولی بہمنی کے دور سے لے کر عادل شاہی اور اس کے بعد آصف جاہی دور میں اس خاندان کو عزت و توقیر بخشی گئی اور خصوصاً عادل شاہوں نے ان کو انعام و اکرام اور زینات سے نوازا۔

قلندارانہ بے نیازی، فراخدلی، تواضع وانکساری اوراعلیٰ حوصلگی اس خانوادے کے افراد کی شخصیت کی اہم خصوصیات ہیں۔اس خانوادے کے افراد سبز لباس پہنا کرتے تھے جس کی بنیاد پر انکو سبز پوش بھی کہا جاتا تھا۔چنانچہ زینت ساجدہ کے دادا سیّد رسول قادری سبز پوش کے نام سے ہی معروف ومقبول تھے۔سیّد رسول القادری نے دینی علوم کے علاوہ عصری علوم سے بھی استفادہ کیا تھا اور آصف سابع کے دور میں حکومت حیدرآباد کے محکمہ تعلیمات سے وابستہ ہوئے جہاں ابتدا میں وہ ناظر وپھر مددگار ناظم کی حیثیت سے عہدہ سنبھالا اور اپنی خدمات انجام دیں۔اپنی ان خدمات کی انجام دہی کے دوران انہوں نے اپنے خانوادے کی روایات کو برقرار رکھتے ہوئے بنیادی مراتب کے ساتھ ساتھ خانوادے کے سربراہ کی حیثیت سے تلقین اور رشدوہدایت کا سلسلہ جاری رکھا اسی زمانے میں مولوی عبدالحق نے ناظم تعلیمات کی حیثیت سے جب کام شروع کیا اور جب ان کو سیّد رسول کے بارے میں علم ہوا تو انہوں نے اپنی ڈکشنری والے کام میں ان کو اپنا شریک ومعاون بنایا۔زینت ساجدہ کے ددھیالی رشتے دار آج بھی گلبرگہ میں سکونت پذیر ہیں۔

زینت ساجدہ کے والد سید مصطفیٰ قادری سبز پوش نے تدریس کے پیشے کو اپنایا چونکہ اس خاندان کو عادل شاہوں کے ذریعے بہت ساری زمینیں انعامات کے طور پر عطا کی گئی تھیں اس لئے اس خاندان کو انعامدار کے نام سے بھی مقبولیت حاصل ہوئی تھی۔ان کی سات بیٹیاں اور تین بیٹے ہوئے بعد میں زینت ساجدہ کو چھوڑ کر باقی تمام اولادیں پاکستان منتقل ہوگئیں۔

ولادت

ڈاکٹر زینت ساجدہ ۲۸ رمئی ۱۹۲۴ء کو اپنے نانا سید احمد قادری المعروف بہ گل امین کے گھر رائچور کرناٹک کے اندرونی قلعہ میں سید حفیظ النساء کے بطن سے پیدا ہوئیں۔زینت ساجدہ کا پورا نام زینت النساء ساجدہ بانو ہے۔خونی رشتوں کی طہارت اور تقدس حق گوئی وحق پرستی زینت ساجدہ کو ورثے میں ملی تھی اس بنیاد پر یہ انکار نہیں کیا جاسکتا کہ علم تصوف، طریقیت اور معرفت ان کے رگ رگ میں بسی ہوئی تھی۔ان کے خاندان کے افراد میں وضع داری، رکھ رکھاؤ اور مشرقی تہذیب کے عناصر ملتے ہیں۔چنانچہ

زینت ساجدہ پر بھی اس کا اثر لازمی طور پر ہوا جوان کی شخصیت کا نمایاں حصہ ہے۔

تعلیم وتربیت

زمانے کی روایات اور رسم ورواج کے مطابق زینت ساجدہ کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی۔ان کی ابتدائی تعلیم قرآن ودینیات سے ہوئی۔زینت ساجدہ بچپن سے ہی ہونہار وذہین تھیں اس لئے ان کے دادا ان کو بہت پیار کرتے تھے یہی وجہ ہے کہ وہ بھی اپنے دادا سے بے پناہ پیار کرتی تھیں۔جب ایک مرتبہ ان سے پوچھا گیا کہ آپ زندگی میں سب سے زیادہ کس سے متاثر ہیں تو انہوں نے بلاتکلف اپنے دادا کا نام لیا۔ان کے دادا ملازمت کی غرض سے حیدرآباد میں مقیم تھے اور ان کے والد بھی حیدرآباد منتقل ہو چکے تھے۔زینت ساجدہ نے حیدرآباد میں ہی تعلیم حاصل کی۔

زینت ساجدہ نے ابتدائی جماعت سے لے کر ثانوی جماعت کی تعلیم مدرسہ تعلیم المعلمات ، کاچی گوڑہ سے حاصل کی۔بچپن سے ہی تحریری وتقریری صلاحیت ہونے کے باعث دوران تعلیم انہوں نے کئی مقابلوں میں حصہ لیا اور انعام بھی حاصل کیا۔جب زینت ساجدہ درجہ چہارم کی طالبہ تھی تو انہوں نے ایک ڈرامہ ''باغبان'' لکھ کر اساتذہ کو حیرت میں ڈال دیا اور ان کے اس کارنامے پر ان کے دادا کے بڑے بھائی مولوی سید عبدالقادر نے ایک روپیہ سکہّ عثمانیہ بطور انعام پیش کیا اور گھر کے افراد کی طرف سے ان کی خوب حوصلہ افزائی کی گئی۔اور یہ بات ۳۵-۱۹۳۴ء کے دور کی ہے جب ایک روپیہ بہت ہی قدر کا حامل تھا۔جماعت نہم میں زیر تعلیم تھیں کہ نشر گاہ حیدرآباد (ریڈیو) سے کہانیاں اور معلوماتی مضامین نشر کرنے لگیں۔

ثانوی جماعت کی تعلیم کے دوران زینت ساجدہ نے جن اساتذہ سے شرف تلمّذ حاصل کیا انمیں تسنیم ربّانی ،قطب النساء ہاشمی اور مسز اکرم ہیں۔زینت ساجدہ کے علمی ذوق وشوق کو پروان چڑھانے میں اِنہیں اساتذہ نے اہم کردار ادا کیا اور ہر ممکن رہنمائی وہمت افزائی کی۔

زینت ساجدہ نے ۱۹۴۱ء میں میٹرک کا امتحان پاس کیا اور یہ گمان کیا جانے لگا کہ شاید اب ان کا تعلیمی سفر یہیں پر ٹھہر جائے گا اور ازدواجی زندگی کے سفر کا آغاز ہوگا۔لیکن زینت ساجدہ کے تعلیمی شوق نے

اور تعلیم نسواں کے تئیں ان کے خاندانی رویے نے ان کو تعلیمی سلسلہ جاری رکھنے کا موقع عنایت کیا چنانچہ ۱۹۴۳ء میں زینت ساجدہ نے ویمنس کالج سے ایف۔اے اور پھر ۱۹۴۵ء میں بی۔اے کا امتحان پاس کیا اور پھر ۱۹۴۷ء میں عثمانیہ یونیورسٹی کے آرٹ کالج سے ایم۔اے (اردو ادب) میں کامیابی حاصل کی۔ ۱۹۶۴ء میں آپ نے عثمانیہ یونیورسٹی سے دکنی شاعری کے اولین دور کے مخطوط اشرف بیابانی کی مثنوی ''نوسرہار'' پر پروفیسر مسعود حسن خان صدر شعبہ اردو اور ڈاکٹر حفیظ قتیل کی نگرانی میں اپنا پی۔ایچ۔ڈی کا مقالہ تحریر کیا اور انہوں نے اپنا یہ مثالی تحقیقی کارنامہ پروفیسر حبیب الرحمٰن بانی ریاستی انجمن ترقی اردو کے اصرار پر انجام دیا۔ چونکہ زینت ساجدہ فطری طور پر دکن سے تعلق رکھتی تھیں اس لئے زیادہ مشکلات کا سامنا نہ کرنا پڑا اور پھر باصلاحیت اساتذہ کی نگرانی میں یہ کام بہت ہی خوش اسلوبی کے ساتھ پایہ تکمیل تک پہنچایا۔ ۱۹۷۳ء میں مقالہ داخل کیا اور ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔ زینت ساجدہ بچپن سے ہی ذہین و فطین تھیں جس کی وجہ سے ان کا تعلیمی ریکارڈ ابتدائی جماعت سے ہی بہتر رہا۔ اسکول میں وہ ہمیشہ اوّل آتی تھیں اور ایف۔اے اور بی۔اے درجہ دوم میں کامیابی حاصل کی۔ ایم۔اے میں زینت ساجدہ پہلے درجے کے علاوہ سب سے زیادہ نشانات حاصل کرنے والی طالب علم رہیں اور فرسٹ ان فرسٹ کا خطاب حاصل کیا۔ ابتدائی دور سے ہی ان کو اردو سے والہانہ لگاؤ تھا جس کی بناء پر امتحانات میں اردو کے پرچے میں سب سے زیادہ نشانات حاصل کرتی تھیں۔

ملازمت

زینت ساجدہ کو دوران تعلیم ہی ملازمت کی پیشکش کی گئی لیکن انہوں نے اس پیشکش کو قبول نہیں کیا۔ ۱۹۴۷ء کا زمانہ تھا جب سرزمین حیدرآباد میں بھی آزادی کے نعرے بلند ہو رہے تھے اور ہندوستانی لوگ ملک کی آزادی کے خواب سجائے ہوئے تھے۔ اس دور میں آصف جاہی سلطنت ایک نازک دور سے گزر رہی تھی۔ بلبل ہند سروجنی نائیڈو ہندوستانی عورتوں کو آزادی کی لڑائی میں شمولیت کا پیغام دے رہی تھیں۔ عورتوں کا روایتی کردار ختم ہو رہا تھا عورتیں اس دور میں داخل ہو رہی تھی جہاں روزگار حاصل کرنے کے لئے مردوں کے مدمقابل کھڑی ہوسکیں لیکن قدامت پسند طبقہ ابھی بھی عورتوں کی ترقی کی راہ میں حائل

تھا اور آزادی نسواں کی مخالفت کر رہا تھا۔آزادی نسواں کے تصور نے زینت ساجدہ کو ایک نئی فکر اور روشنی بخشی اور ان کا ذہن نئی تعلیم کی طرف راغب ہوگیا۔اس طرح انہوں نے ۱۹۴۷ء میں ہی ایم۔اے کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد ویمنس کالج میں بحیثیت اردو لکچرر ملازمت اختیار کی۔ملازمت کے ابتدائی دور میں دینیات اور اخلاقیات بھی پڑھایا لیکن اردو ادب کی استاد کی حیثیت سے جو شہرت و مقبولیت حاصل کی وہ اور کسی کے حصہ میں نہ آسکی۔انکا کوئی بھی شاگرد ایسا نہیں ہے جو ان سے متاثر نہ ہو اور محبت و عقیدت نہ رکھتا ہو۔ ۱۹۶۸ء میں زینت ساجدہ بحیثیت ریڈر مقرر ہوئیں اور وظیفہ حسن خدمت حاصل کرنے سے دیڑھ سال قبل انہوں نے بحیثیت صدر شعبہ اردو اپنی خدمات کو انجام دیا۔۱۹۸۳ء میں زینت ساجدہ کا تقرر بحیثیت پروفیسر ہوسکتا تھا لیکن انہوں نے اپنی تند مزاجی اور قلندرانہ صفات کے باعث انٹرویو میں شرکت نہیں کی اور اس عہدے کو قابل اعتناء نہ سمجھا۔۱۹۸۴ء میں زینت ساجدہ ملازمت سے سبکدوش ہوئیں۔

ازدواجی زندگی

زینت ساجدہ نے ایم۔اے کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد یونیورسٹی کے ساتھی شاہد حسینی سے ۱۹۵۸ء شادی کرلی۔یہ شادی دراصل قدیم روایتی طرز پر قائم نہ ہوئی بلکہ دونوں دوران تعلیم ہی جذباتی لگاؤ کی بناء پر ایک دوسرے کے قریب ہوئے۔زینت ساجدہ ذہنی طور پر ترقی پسند تحریک سے وابستہ تھیں اور انجمن ترقی پسند مصنفین کے جلسوں،سمیناروں اور مشاعروں میں شرکت اور خیالات کی ہم آہنگی نے ایک دوسرے کو قریب کیا۔ترقی پسند تحریک ایک ایسے ادب کی تشکیل کرنا چاہتی تھی جس میں سماج کا ہر فرد جبر وظلم، استحصال غریبی اور افلاس سے آزاد ہو اور سماج کے اندر عدل وانصاف ومساوات کا چراغ روشن ہو۔زینت ساجدہ بھی ادب کے ذریعے ایک نئے سماج کی تشکیل کے لئے کوشاں تھیں اور ان کے دل میں بھی سماجی خواہشات انگڑائیاں لے رہی تھیں جس کی بدولت ان کا افسانوی مجموعہ ''جلترنگ'' وجود میں آیا۔حسینی صاحب بھی ایک متوسط گھرانے سے تعلق رکھتے تھے اور ترقی پسند رجحانات کے حامل تھے ان کو بھی مختلف سیاسی برائیاں جیسے اوہام پرستی،قدامت،فرقہ پرستی سے نفرت تھی اور وہ بھی ادب کے ذریعے ہی سماج کو ایک نئی راہ پر گامزن کرنا چاہتے تھے زینت ساجدہ اور حسینی شاہد نظریاتی ہم آہنگی کی بنیاد پر ایک دوسرے

کے قریب ہوتے چلے گئے۔اس دور میں حیدرآباد میں ایسی شادی جرأت رندانہ تھی لیکن حسینی شاہد ترقی پسند خیالات وفکر کے حامی تھے جسکی بناپرانہوں نے تمام روایات کوپس پشت ڈالتے ہوئے زینت ساجدہ کے ساتھ ازدواجی رشتہ قائم کیا۔ دراصل حسینی شاہد زینت ساجدہ کی ادبی شخصیت سے بہت متاثر تھے۔ یہ شادی دراصل دوادیبوں اوردانشوروں کا ملاپ تھی جودونوں کی زندگیوں میں بہار کا پیغام لائی۔

شادی کے بعد دونوں کی ازدواجی زندگی بہت خوشگوار رہی اورعمر کے آخری ایام تک دونوں اپنی ازدواجی زندگی سے مطمئن اورخوش رہے۔دونوں میاں بیوی میں والہانہ محبت اوراٹوٹ لگاؤ تھا زینت ساجدہ اپنے شوہرکو بے انتہا چاہتی تھیں۔ عاتق شاہ نے اپنے ایک مضمون میں ان کی ازدواجی زندگی کے بارے میں ایک واقعہ کے حوالے سے یوں روشنی ڈالی:

> ''ابھی چندسال پہلے کی بات ہے شاہد سخت بیمار پڑے اورانہیں پیٹ کے ایک نہیں دوآپریشن کروانے پڑے اوردواخانے میں ایک لمبے عرصے تک رہنا پڑا۔ بیہوشی اورنیم بے ہوشی کی کیفیت میں انہوں نے کئی گھنٹے گزارے۔اس وقت زینت کی حالت کچھ نہ پوچھیئے۔ یونیورسٹی کیا ساری دنیا چھوڑکروہ ہفتوں اپنے شوہرکے سرہانے یاپائینتی بیٹھی رہیں، چپ چاپ، خاموش خاموش،صرف گھڑی کی ٹک ٹک سنتی ہوئی یامنہ ہی منہ میں کچھ پڑھتی ہوئیں۔''[1]

اس بات سے ہم یہ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ بحیثیت بیوی زینت ساجدہ کی خدمت گذاری اوروفا شعاری کا علم ہوتا ہے اوریہ بھی پتہ چلتا ہے کہ وہ اپنے شوہر کی صحت کو لے کرکتنی فکرمند تھیں۔انہوں نے اپنے شوہر کی تیمارداری میں کوئی کسرنہیں چھوڑی۔ ہروقت اپنے شوہر کی خدمت میں اپنے آپ کومصروف رکھا۔'شوہرمجازی خداہوتاہے' زینت ساجدہ کی محبت وخدمت نے اس قول کودرست ثابت کردی۔

زینت ساجدہ ایک وفادار،شوہر پرست اورفرمابردار بیوی تھیں۔انہوں نے اس رشتے کو بڑی خوبصورتی اورذمہ داری کے ساتھ نبھایا۔ملازمت پیشہ خاتون ہونے کے باوجودبھی انہوں نے اپنے گھریلوفرائض سے اجتناب نہیں کیا۔شوہر کے ساتھ بڑی عاجزی ونرمی کے ساتھ پیش آنا اوران کا

۱۔ عاتق شاہ،ایک آوازایک تاثر، پونم(زینت ساجدہ نمبر)،حیدرآباد، جون۔جولائی۱۹۸۳ء،ص۳۱

بھرپور خیال رکھنا وہ اپنا فرض سمجھتی تھیں۔ عاتق شاہ نے اپنے مضمون میں زینت ساجدہ کی شخصیت کے ایک خاص پہلو پر روشنی ڈالی ہے:

> ''آخر میں ایک راز کی بات بتادوں اور وہ یہ ہے کہ انٹیلیکچول خاتون ڈاکٹر زینت ساجدہ اپنے شوہر ڈاکٹر حسینی سے بے حد ڈرتی ہیں۔ شاہد کے حکم کے بغیر گھر کے ایڈمنسٹریشن کا کوئی پتہ نہیں کھڑکتا۔ یہی نہیں بلکہ زینت اپنے میاں کے سامنے چیں تک نہیں کرتیں خواہ وہ ادبی گفتگو ہو یا علمی یا سیاسی یا کوئی اور یوں مسکراتی ہوئی پان بناتی بیٹھی ہیں جیسے سو فیصد گھریلو قسم کی کوئی خاتون جسے دھوبی کا حساب لکھنے کے سوا کچھ نہیں آتا۔''[1]

اس اقتباس سے علم ہوتا ہے کہ گھریلو اور ازدواجی زندگی کو خوشگوار بنانے کا حسن زینت ساجدہ کو بخوبی آتا تھا اور وہ اپنے ازدواجی رشتہ میں ایک وفادار اور نیک بیوی ثابت ہوئیں۔

اولاد

زینت ساجدہ اور حسینی شاہد کی تین اولادیں ہوئیں۔ جن میں دو صاحبزادے اور ایک صاحبزادی ہیں۔ انہوں نے اپنے صاحبزادے کا نام سجاد شاہد اور فیضی شاہد اور بیٹی کا نام آمنہ شاہد رکھا۔ جس طرح سر سید احمد خان نے اپنے بیٹے کا نام اپنے انگریز دوست کے نام پر 'راس' مسعود رکھا تھا ٹھیک اسی طرح زینت ساجدہ نے بھی اپنے بیٹے کا نام پروفیسر سید سجاد کے نام پر رکھا۔ زینت ساجدہ کی صاحبزادی آمنہ شاہد کو بھی ادب سے دلچسپی رہی لیکن انہوں نے عثمانیہ یونیورسٹی سے انگریزی ادب میں ایم۔اے کیا ہے اور اورینٹل اردو کالج میں بحیثیت لکچرر انگریزی تدریسی فرائض کو انجام دے رہی ہیں۔ بڑے صاحبزادے سجاد شاہد نے سیول انجینئرنگ کی تعلیم علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے مکمل کی ہے اور اسی کو انہوں نے اپنا ذریعہ معاش بھی بنایا۔ اردو کی خدمت گزاری ان کو ورثے میں ملی ہے اور اسی بنیاد پر وہ ''اردو مجلس'' کے معتمد عمومی کی حیثیت سے بھی اس اعزازی خدمات کو انجام دے رہے ہیں۔ چھوٹے صاحبزادے فیضی شاہد نے نظام کالج سے بی۔اے کیا اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے ایم۔بی۔اے کی ڈگری حاصل کی۔

---

[1] عاتق شاہ، ایک آواز ایک تاثر، پونم (زینت ساجدہ نمبر)، حیدرآباد، جون۔ جولائی ۱۹۸۳ء، ص ۳۰

بیرونی ممالک کا سفر

زینت ساجدہ نے ایک دفعہ پاکستان کا سفر کیا تھا یہ ان کا انفرادی سفر تھا۔سفر کا اہم مقصد والدہ صاحبہ کی عیادت اور مزاج پرسی کرنا تھا۔انھوں نے ایک انٹرویو میں اس سفر کا ذکر کرتے ہوئے وہاں کی ادبی دنیا کی عکاسی کی ہے کہ وہاں کے لوگ مختلف النوع تحریریں پڑھنے کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ادبی رسائل کا حال اس قدر حوصلہ افزا نہیں ہے۔وہاں پر ڈائجسٹ رسائل کو مقبولیت حاصل ہے۔اس کے علاوہ آج کے ادیب کے غم ذات نے اسے دوسروں سے بے تعلق کر دیا ہے۔فکشن کا تعلق عوام کے مسائل اور دلچسپی دونوں سے ہوتا ہے۔انہوں نے ادبی رسائل نکالنے والوں کو یہ مشورہ بھی دیا ہے کہ وہ اس کو فل ٹائم ورک سمجھیں۔نکاسی، تشہیر اور ترتیب کے لیے علیحدہ علیحدہ شعبہ ہو اور ہر ماہ کا رسالہ وقت مقررہ پر پڑھنے والوں تک پہنچے۔

ادبی سفر

زینت ساجدہ بچپن ہی سے ذہین طالبہ ہونے کے سبب اساتذہ کے درمیان بہت ہی عزیز تھیں۔ابتدائی دنوں ہی سے انہیں لکھنے کا ذوق وشوق تھا۔ جب وہ نویں جماعت کی طالبہ تھی تب نشر گاہ حیدر آباد سے ان کی کہانیاں اور معلوماتی مضامین نشر ہونے لگے تھے۔جماعت چہارم میں انہوں نے ایک ڈرامہ ''باغبان'' لکھ کر اپنی تحریری صلاحیتوں اور ادب سے دلچسپی کا ثبوت پیش کیا۔چونکہ وہ ادبی ذوق وشوق رکھنے والے خانوادے سے تعلق رکھتی تھیں اس لئے بچپن ہی سے ان کے لکھنے پڑھنے کے شوق کو فروغ ملا۔اخبارات، رسائل اور مفید اصلاحی، علمی، ادبی اور افسانوی کتابوں کے مطالعہ سے ان کی ذہنی صلاحیت پروان چڑھی۔ایک مرتبہ جب انہوں نے ڈرامے میں حصہ لیا تھا تو بطور انعام ان کو کتابوں کا سیٹ ملا اور گھر پر بھی مختلف قسم کے ادبی رسالے پابندی سے آیا کرتے تھے جس سے ان کے اندر مطالعہ اور لکھنے کی جستجو اور بڑھتی گئی۔

۱۹۴۷ء کا وہ دور تھا جب زینت ساجدہ ایم۔اے (سال دوم) کی طالبہ تھیں۔اس وقت ان کے افسانوں کا مجموعہ ''جلترنگ'' منظر عام پر آیا۔اس مجموعہ کی اشاعت نے زینت ساجدہ کو ادبی دنیا میں

شہرت ومقبولیت عطا کی۔ دوران تعلیم ایم۔اے ہی میں انھوں نے پروفیسر سجاد کی نگرانی میں اردو غزل پر ایک مقالہ تحریر کیا اور پورے ادارہ میں وہ اپنی فعال صلاحیت کی بنیاد پر مقبول رہیں۔اس کے بعد ان کی دو کتابیں ''محبّ وطن خواتین'' اور ''حکمران عورتیں'' بھی شائع ہوئیں۔ ''تلگو ادب کی تاریخ'' ۱۹۶۰ء میں شائع ہوئی۔ دو کتابیں ''کلیات شاہی'' اور ''عادل شاہ ثانی'' دکنیات شناسی میں اہمیت رکھتی ہیں اسی سال شائع ہوئیں۔اس کے علاوہ ایک تلگو ناول کا ''تاش کے محل'' کے نام سے اردو میں ترجمہ کر کے شائع کیا۔ یہ ترجمہ تلگو زینت ساجدہ کی فعال صلاحیتوں کو نمایاں کرتا ہے۔

۱۹۶۴ء میں آپ نے عثمانیہ یونیورسٹی سے دکنی شاعری کے اولین دور کے مخطوط اشرف بیابانی کی مثنوی ''نوسر ہار'' پر پروفیسر مسعود حسن خان صدر شعبہ اردو اور ڈاکٹر حفیظ قتیل کی نگرانی میں اپنا پی۔ایچ۔ڈی کا مقالہ تحریر کیا اور انہوں نے اپنا یہ مثالی تحقیقی کارنامہ پروفیسر حبیب الرحمٰن بانی ریاستی انجمن ترقی اردو کے اصرار پر انجام دیا۔ چونکہ زینت ساجدہ فطری طور پر دکن سے تعلق رکھتی تھیں اس لئے زیادہ مشکلات کا سامنا نہ کرنا پڑا اور پھر باصلاحیت اساتذہ کی نگرانی میں یہ کام بہت ہی خوش اسلوبی کے ساتھ پایہ تکمیل تک پہنچایا۔ کہانیاں سننا اور کہنا انسانی فطرت میں شامل ہے اور فکشن سے ان کا لگاؤ ایک فطری امر ہے۔ابتدائی دور میں انہوں نے بہت سی کہانیاں اور انشائیے لکھے۔ایک ہی نشست میں قلم برداشتہ لکھنا ان کی عادت میں شامل تھا۔ان کی تخلیقات افکار (بھوپال)، نظام (ممبئی)، سب رس (حیدرآباد)، ادبی دنیا (لاہور) اور حیدرآباد کے چند قدیم رسائل ہفت روزہ نقش ونگار، ماہنامہ دیوان اور رباب ویکلی میں جرائد کے مدیر کی فرمائش پر شائع ہوتی رہیں۔روزنامہ سیاست میں بھی ان کے صاف ستھرے انشائیے شائع ہوتے رہے۔

ڈاکٹر زینت ساجدہ بلند پایہ ادیب ہونے کے ساتھ ساتھ معتبر نقاد اور نامور محقق بھی ہیں۔انہوں نے تحقیق وتنقید کے میدان میں بھی اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوایا ہے۔زینت ساجدہ کے تحقیقی وتنقیدی کارناموں میں حیدرآباد کے ادیب (حصہ اول ودوم)، تلگو ادب کی تاریخ (مرتبہ)، نوسر ہار (تدوین) غیر مطبوعہ اور مثنوی من لگن (دیوناگری رسم الخط میں) قابل ذکر ہیں۔

یوں تو زینت ساجدہ کے دور سے پہلے بھی تذکرے لکھے جاتے تھے لیکن ان تذکروں میں صرف

شعراء کے حالات وکلام کو ہی شامل کیا جاتا رہا ہے۔نثر نگار کے تذکروں کی طرف کم ہی توجہ دی گئی۔اس مناسبت سے یہ کتاب ''حیدرآباد کے ادیب'' بہت اہمیت کی حامل ہے۔ساہتیہ اکیڈمی کی جانب سے اس کتاب کو تیار کرنے کی ذمہ داری ڈاکٹر زینت ساجدہ کو سپرد کی گئی تھی۔اس کتاب میں ۱۹۰۰ء سے لیکر ۱۹۶۰ء تک کے تمام ادیبوں کی مختصر سوانح اوران کے مضامین کو جگہ دی گئی ہے۔اس کتاب کو دوجلدوں میں شائع کیا گیا۔اس تذکرے کی پہلی جلد ۱۹۵۸ء میں شائع ہوئی اور دوسری جلد ۱۹۶۲ء منظر عام پر آئی۔

اس تذکرے میں موجودہ مضامین کو اصناف ادب کے لحاظ سے ترتیب دیا گیا ہے۔حالانکہ اس ترتیب کے باوجود بھی ایک غلطی کی نشاندہی کی گئی ہے اور وہ یہ کہ عنوان ''انشائیہ'' کے تحت تحقیقی وتنقیدی مضامین کو بھی شامل کیا گیا ہے۔مثلاً دکنی ادب کی روایات (حسینی شاہد)، دکھنی زبان کی چند لسانی خصوصیات (عبدالقادر سروری)، اردو زبان کی تشکیل کا ابتدائی دور (شمس اللہ قادری) وغیرہ۔ان موضوعات کو ترتیب دینے میں مرتب نے مضمون اور انشائیہ کے درمیان کوئی تفریق نہیں کی۔اس چھوٹی سی بھول سے قطع نظر یہ ایک اہم تذکرہ ہے جس میں مختلف اصناف ادب کے انتخاب سے استفادہ کیا جاسکتا ہے جو یقینی طور پران کی پرخلوص محنت اور ادبی کاوشوں کا نتیجہ ہے۔

''کلیات شاہی'' ڈاکٹر زینت ساجدہ کا مرتب کیا ہوا ایک اہم کارنامہ ہے۔اس کارنامے کو انھوں نے ۱۹۶۲ء میں پایہ تکمیل تک پہنچایا۔مبارز الدّین رفعت جو کلیات کے مشہور محقق ہیں انہوں نے بھی اسی سال میں ''کلیات شاہی'' کو مرتب کیا جو دہلی سے شائع ہوا تھا۔دونوں محققین کا ماخذ ایک ہی ہے۔دونوں نے سینٹرل ریکارڈ آفس میں موجود مخطوطے اور سالار جنگ لائبریری میں مخزونہ بیاضوں کے علاوہ ''ادارہ ادبیات اردو'' کی بیاضوں سے استفادہ کیا ہے۔

زینت ساجدہ نے کلیات شاہی پر ۱۱۴صفحات کا مفصل مقدمہ لکھا ہے۔اس مقدمے میں عادل شاہ ثانی کے متعلق معلومات کے علاوہ ان کے کلام پر ایک جائزہ پیش کیا گیا ہے۔انہوں نے شاہی زبان کا استعمال کرتے ہوا اور اس عہد کی زبان پر بھی روشنی ڈالی ہے جو بلاشبہ مقدمہ کو ایک حیثیت اور وقار عطا کرتی ہے۔اس کے علاوہ اس عہد کے شاہی رسم الخط پر بھی انھوں نے بحث کی ہے۔تدوین متن کے بعد مشکل

الفاظ اصطلاحات اور دیومالائی کرداروں کی تفصیلات وتشریحات کو الگ سے تحریر کیا ہے۔ مقدمہ کے آخر میں فرہنگ بھی دی گئی ہے۔

قدیم اردو ادب کے مثنویوں میں اشرف بیابانی کی مثنوی ''نوسر ہار'' کو کافی اہمیت حاصل ہے۔ زینت ساجدہ کو دکھنی زبان پر خاص مہارت حاصل تھی اور انہیں دکنی ادب سے بہت زیادہ دلچسپی بھی تھی۔ کلیات شاہی کی تدوین کا کام دکنی ادب پر ان کی مہارت ہونے کا ثبوت پیش کرتا ہے۔ انہوں نے اپنے پی۔ایچ۔ڈی کے مقالہ کے لیے مثنوی ''نوسر ہار'' کی لسانی اہمیت کے پیش نظر موضوع کو منتخب کیا۔ اس مثنوی کو مرتب کرنے کے بعد انہوں نے ۱۹۷۳ء میں مقالہ مکمل کیا اور ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔

زینت ساجدہ نے اپنے پی۔ایچ۔ڈی کے مقالہ میں قدیم زبان کا تفصیلی جائزہ لیا ہے۔ صوتی، صرفی اور نحوی خصوصیات کا جائزہ لیتے ہوئے انہوں نے اشرف بیابانی کی شاعرانہ محاسن اور فنی خصوصیات پر بحث کی ہے اور بطور مثال کئی اشعار بھی پیش کیے ہیں۔ زینت ساجدہ نے نہ صرف اندرونی شہادتوں بلکہ خاندانی شجروں، خلافتوں اور اورنگ آباد گزٹ جیسے بنیادی ماخذوں سے بھی استفادہ کیا ہے تا کہ غلط روایات کی نشاندہی کی جاسکے اور صحیح ومعقول نتیجہ اخذ کیا جاسکے۔ اس تحقیق میں انہوں نے کئی تسامحات اور غلط بیانیوں کی نشاندہی کی ہے۔ مقالہ کے اختتام پر طویل فرہنگ دی گئی ہے اور ایک سے زائد الفاظ کے معنی دیئے گئے ہیں۔ یہ مقالہ غیر مطبوعہ ہے۔ اردو دانشوروں کے مطابق یہ مقالہ اردو ادب کا ایک اہم تحقیقی کارنامہ ہے اگر یہ شائع ہو جائے تو اردو دنیا ایک قدیم اور نایاب شہ پارے سے متعارف ہوسکتی ہے۔

زینت ساجدہ نے افسانہ کے علاوہ انشائیہ نگاری میں بھی طبع آزمائی کی ان کا پہلا انشائیہ ''اگر میں مرد ہوتی'' ستمبر ۱۹۴۵ء میں شائع ہوا۔ اس کے بعد کئی انشائیے رسالوں، ماہناموں اور اخباروں میں وقتاً فوقتاً شائع ہوتے رہے۔ ان انشائیوں میں خالہ ماں سلام، بی جمالو، گنڈی پیٹ کا پانی، اگر میں مرد ہوتی، دیکھا دیکھی، مکان بناڈالا، وغیرہ ان کے مشہور انشائیے ہیں۔

زینت ساجدہ کے انشائیوں کی خاص بات حقیقت پسندی اور اسلوب بیان ہے۔ وہ ایک کامیاب افسانہ نگار بھی تھیں اور یہی وجہ ہے کہ ان کا انداز بیان بہت عمدہ ہے۔ ان کے انشائیوں کی زبان

شگفتہ اور طنز و مزاح سے بھرپور ہے۔وسیع مطالعہ کی بنیاد پر انہیں تمام موضوعات پر قدرت حاصل ہے۔انہوں نے اپنے انشائیوں میں عصر حاضر کے مسائل کو بڑے ہی بے باک اور طنزیہ انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔انھوں نے ایک انشائیہ ''مکان بنا ڈالا'' کے عنوان سے لکھا ہے جس میں انہوں نے زمین کی خرید وفروخت سے لیکر مکان تیار ہونے تک کے درپیش مسائل کو بہت خوبصورت اور مزاحیہ انداز میں بیان کیا ہے۔اس انشائیہ کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

> ''کسی زمین کے متعلق معلوم ہوا کہ مکان مالک ایک ہے۔کاغذات دوسرے نے داغ رکھے ہیں،تیسرے کے پاس رہن نامہ ہے اور چوتھا عدالت میں مقدمہ لڑ رہا ہے۔کہیں نالی کا جھگڑا،کہیں پرنالے کا۔کہیں پڑوس اچھا نہیں،کہیں رخ ٹھیک نہیں۔کہیں بہت بڑی کہیں بہت چھوٹی۔کہیں نشیب میں کہیں دلدل میں۔جب ہم زمین کا رونا کسی کے آگے روتے تو وہ بڑے اطمینان سے کہتا ابھی تک زمین ہی کے چکر میں ہو! ابتدائے عشق ہے روتا ہے کیا آگے آگے دیکھیے۔۔۔۔' [1]

زینت ساجدہ کے انشائیے ان کے مشاہدات و تجربات کے آئینہ دار ہیں۔انہوں نے زندگی کے ہر واقعہ کا بڑی گہرائی سے مشاہدہ کیا ہے اور اپنے تجربات کے ذریعے انہوں نے بہت سے مسائل کا حل بھی پیش کیا ہے۔چنانچہ انشائیہ ''دیکھا دیکھی'' کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو جس میں انہوں نے اپنے مشاہدے کے ذریعہ سماج کے افراد کی عکاسی کی ہے۔

> ''خواہ وہ ملک ہو کہ قومیں،مرد ہوں کی عورت،بوڑھے ہوں کی بچے کسی نہ کسی طرح فیشن زدہ نظر آئیں گے۔ہم نے ہر چیز کے جتنے فیشن بدلتے دیکھے اس سے یہی اندازہ ہوا کہ پہلے فیشن ضرورت کے لیے ایجاد ہوتا ہے لیکن بعد میں اس کی ضرورت پہچانی نہیں جاتی۔ دیکھا دیکھی سب ہی کرنے لگتے ہیں۔وبا جس تیزی سے پھیلتی ہے اسی تیزی سے ختم بھی ہو جاتی ہے حتیٰ کہ پھر ایک نئی لہر اٹھتی ہے اور سب اس کی طرف دوڑ پڑتے ہیں۔کل تک جو بات اچھی سمجھی جاتی تھی

[1] مکان بنا ڈالا،اسلوب بیان اور،اردو مجلس،حیدرآباد،۲۰۰۹ء،ص ۴۵

اس میں سوعیب نکل آتے ہیں۔یہی نہیں کسی غافل کو فیشن کے جانے کی خبر نہیں ہوئی تو لوگ اس پر ہنستے ہیں، اس کا مذاق اڑاتے ہیں۔'' [1]

اس اقتباس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ایک اچھی انشائیہ نگار ہیں۔ان کے انشائیوں کا تفصیلی تجزیہ تیسرے باب میں آئے گا۔

ڈاکٹر زینت ساجدہ اردو کی استاد، نقاد اور انشاء پرداز بننے سے پہلے ایک افسانہ نگار تھیں اور آج بھی حیدرآباد کے مشہور و مقبول افسانہ نگاروں کی صف میں ایک ناقابل فراموش مقام رکھتی ہیں۔وہ ترقی پسند تحریک کی ایک نمائندہ افسانہ نگار تھیں۔زینت ساجدہ کو طالب علمی کے دور سے ہی ادبی ذوق وشوق تھا اور ابھی وہ نویں جماعت کی طالبہ ہی تھیں کہ ان کے افسانے اور مضامین آل انڈیا ریڈیو حیدرآباد سے نشر ہونے لگے تھے۔

زینت ساجدہ کا پہلا افسانہ ''لاٹری'' جو انہوں نے مضمون کے طرز پر لکھا ہے ماہنامہ ''شہاب'' حیدرآباد میں شائع ہوا۔اس کے بعد ان کے کئی افسانے و مضامین رسائل و جرائد جیسے افکار (بھوپال)، نظام (ممبئی)، سب رس، ایوان (حیدرآباد)، ادبی دنیا (لاہور) ہفت روزہ نقش ونگار (حیدرآباد)، زباب ویکلی (حیدرآباد) اور روزنامہ سیاست (حیدرآباد) میں شائع ہوتے رہے۔

زینت ساجدہ کے افسانوی مجموعہ'' جلترنگ'' میں دس (۱۰) افسانے موجود ہیں۔اسکے علاوہ ''اسلوب بیان اور'' میں ان کے نو (۹) افسانے شامل ہیں۔''جلترنگ'' میں شامل افسانے پروانے، کھلاڑی، بی بی، کنول رانی، یونیورسٹی روڈ پر، شہزادی، مذاق، پارو، آخری لمحہ، بجھتا ہوا شعلہ ہے۔

زینت ساجدہ اپنے افسانہ ''پروانے'' میں پروانوں کے سنہری گروہ کو مختلف زاویے سے دیکھتی ہیں۔یہ افسانہ بے حد جذباتی انداز میں قاری کے ذہن کو جھنجھوڑ دیتا ہے ''شہزادی'' اس مجموعہ کا ایک اور کامیاب افسانہ ہے اس میں شہزادی کا کردار بہت عجیب ہے اور یہ عورت عام بیویوں سے بالکل الگ معلوم ہوتی ہے۔لیکن اس کردار کو غیر فطری نہیں کہا جا سکتا ہے۔واقعات نگاری اور نفسیاتی تجزیے کے علاوہ زبان وبیان کے اعتبار سے بھی یہ افسانہ بہت اہم ہے۔

---

[1] دیکھا دیکھی، اسلوب بیان اور، اردو مجلس، حیدرآباد، ۲۰۰۹ء، ص ٦٧

کھلاڑی، مذاق، کنول رانی، پارو، بجھتا ہوا شعلہ، آخری لمحہ زبان و بیان و منظر کشی اور سراپا نگاری اور سب سے اہم سادگی اور سچائی کے اعتبار سے یہ افسانے تخلیقی اہمیت کے حامل ہیں۔ ''بی بی'' اس افسانوی مجموعہ کا سب سے بہتر اور معیاری افسانہ ہے۔ یہ افسانہ اپنے منفرد اور یادگار کردار بی بی کی بدولت اردو کے بہترین افسانوں میں شمار کیے جانے کے لائق ہے۔

''جل ترنگ'' کے افسانے اس دور کے متوسط اور نچلے طبقوں کی طرز معاشرت کی ترجمانی کرتے ہیں۔ان افسانوں میں رومان پرستی قدر مشترک ہے۔

زینت ساجدہ کے افسانوں میں فلسفہ تانیثیت کی جھلک نظر آتی ہے۔انہوں نے حقوق نسواں، آزادی نسواں، ترک رسوم، لڑکیوں کی تعلیم جیسے موضوع کو اپنے افسانوں میں وسعت بخشی ہے۔ یہ وہی دور تھا جب عورتیں گھروں کی چہار دیواری سے نکل کر مردوں کے شانہ بہ شانہ ہو کر اپنی صلاحیتوں اور مہارتوں کا لوہا منوانے کے خواب سجا رہی تھیں اور انہیں خواہشات اور جزبات سے زینت ساجدہ نے اپنے افسانوں کو مزین کیا۔

زینت ساجدہ کی افسانہ نگاری میں نئے دور کا آغاز اس وقت ہوا جب انھوں نے افسانہ ''ارشی'' لکھا۔ زینت ساجدہ کے مزاج میں رومانیت تھی۔ان کے دوسرے دور کے افسانوں میں شدت احساس، گہری داخلیت، سماجی اور فنی بصیرت بدرجہ اتم موجود ہے۔

افسانہ ''ارشی'' ماحول اور موضوع کے لحاظ سے ''بجھتا ہوا شعلہ'' سے بہت حد تک یکسانیت رکھتا ہے۔ دونوں افسانوں کو پڑھنے کے بعد قاری کو یہ احساس ہوتا ہے کہ ''بجھتا ہوا شعلہ'' کا خاموش, کمزور اور شرمیلا اور محروم تمنا ہیرو ''ارشی'' کی صورت میں نظر آتا ہے جو بالکل بے باک, نڈر، بے پرواہ اور متحرک کردار بن کر سامنے آتا ہے اور اپنی شکست فاتحانہ سے افسانوی ادب کا ایک لافانی کردار بن گیا ہے۔ خاندانی زندگی کی حقیقی ترجمانی اور ''ارشی'' کی کردار نگاری سے زینت ساجدہ کے فن کو ایک نئی راہ ملی افسانہ ''ارشی'' اردو دنیا کا ایک بہترین افسانہ مانا جانے لگا۔

''اوتار'' زینت ساجدہ کا ایک اہم اور کامیاب افسانہ سمجھا جاتا ہے۔ جذبات کا اظہار کرنے میں

تخلیق کار نے کہیں بھی مبالغہ آرائی سے کام نہیں لیا ہے۔ گہری داخلیت اور رومانیت نے اس افسانہ کو ایک معتبر اور منفرد مقام عطا کیا ہے۔ راج بہادر گوڑ اس افسانے سے متعلق لکھتے ہیں:

''زینت نے صرف دو تین کہانیاں لکھ کر ہی ادبی حلقوں کو چونکا دیا تھا اور اردو کا ایک عام قاری یہ محسوس کرنے لگا تھا کہ یہ وہی آواز ہے جو اس کے گھر کی چار دیواری میں بند اس کی بیوی، بیٹی، بہن اور محبوبہ کی روح کے کسی گوشے میں صدیوں سے دبی پڑی ہے اور جس نے اظہار کے لئے زینت کو اپنا وسیلہ بنایا۔'' ۱؎

زینت ساجدہ ترقی پسند نظریے کے حامی ہونے کے ساتھ ساتھ حقیقت پسند بھی تھیں۔ ان کی تخلیق میں ترقی پسندی کے عناصر موجود ہیں۔ جب ہم ان کے افسانوں پر نظر ڈالتے ہیں تو حقیقت پسندی زیادہ نظر آتی ہے۔ انہوں نے اپنے افسانوں کو زندگی کے حقیقی واقعات سے آراستہ کیا ہے جس کا اثر قاری کے دماغ پر براہ راست ہوتا ہے یہ ان کے افسانوں کی ایک اہم خوبی ہے۔ خواجہ عبدالغفور لکھتے ہیں:

''زینت ساجدہ ترقی پسند ضرور ہیں لیکن یہ حقیقت پسند زیادہ ہیں ان کے افسانوں کا تناظر جیتے جاگتے، ہنستے ہنساتے، روتے رولاتے، گوشت پوست کے انسانوں سے مزین ہے جن کا لاشعور انہیں کامیاب یا ناکام انسان بناتا ہے۔ ان کے افسانوں کی تکنیک کی منفرد اور بڑی خوبی یہ ہے کہ یہ قاری کو بھی اپنے افسانے کا شریک بنالیتی ہیں وہ محض تماشائی نہیں بلکہ اپنا مقام رکھتا ہے۔ افسانہ نگاری کی کامیابی کا دارومدار اسکی تکنیک پر ہے اور زینت ساجدہ اس تکنیک کی ماہر ہیں شاید اس حقیقت کا پرتو ہے کہ ان کا فن ان کی ذاتی شخصیت کا آئینہ دار ہے۔'' ۲؎

زینت ساجدہ کا مطالعہ وسیع تھا وہ اپنے عہد کے تمام حالات کا گہرائی سے مشاہدہ کرتی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے افسانے ان کے تجربات و مشاہدات کی عکاسی کرتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔

۱؎ عاتق شاہ، ایک آواز ایک تاثر، پونم (زینت ساجدہ نمبر)، حیدرآباد، جون۔ جولائی ۱۹۸۳ء، ص ۲۶

۲؎ خواجہ عبدالغفور، زینت ساجدہ، پونم (زینت ساجدہ نمبر)، حیدرآباد، جون۔ جولائی ۱۹۸۳ء، ص ۲۴

زینت ساجدہ نے اپنے افسانوں میں سادہ سلیس اور دلنشین زبان استعمال کی ہے۔ وہ محاوروں کا استعمال موقع کی نزاکت کو مدنظر رکھتے ہوئے کرتی تھیں جس سے ان کی ذہانت اور سلیقہ مندی کا قائل ہونا پڑتا ہے۔ اپنی اسی ذہانت کی بدولت وہ کم الفاظ میں بہت کچھ کہہ جاتی ہیں۔ ان کے افسانوں میں حیدرآباد کے مخصوص لب ولہجہ کی تاثیر دکھائی دیتی ہے جس کی بنا پر یہ افسانے انفرادی درجہ رکھتے ہیں۔ انھوں نے افسانہ نگاری کے فن کو ضروری لوازمات کے ساتھ اپنی منفرد صلاحیتوں اور خوبصورت اسلوب کا اہتمام کرتے ہوئے اپنے ہم عصر افسانہ نگاروں کی صف میں ایک معتبر مقام حاصل کرلیا ہے۔

ادبی اداروں اور انجمنوں سے وابستگی

حیدرآباد علمی، ادبی اور تہذیبی اداروں کا مرکز رہا ہے۔ اور یہاں مختلف علمی و ادبی سرگرمیوں کو پروان چڑھنے کے بہتر مواقع فراہم ہوئے۔ مشاعرے، ادبی جلسے اور تہذیبی پروگرامس حیدرآباد کی ثقافت کو زینت بخشتے ہیں۔ جامعہ عثمانیہ کے وجود میں آنے کے بعد ان سرگرمیوں کو فروغ حاصل ہوا۔ میر حسن، مخدوم، اکبر وخاقانی اور دیگر ادبی ذوق وشوق رکھنے والوں نے حیدرآباد کی ادبی وتہذیبی فضا کو پر جوش بنایا۔ یہ وہ دور تھا جب زینت ساجدہ اپنی ابتدائی تعلیم کی حصولیابی کررہی تھیں اور وہ ان تمام سرگرمیوں سے بخوبی واقف تھیں۔ چوتھی جماعت سے ہی ان کے اندر ادبی دلچسپی ظاہر ہونے لگی تھی اور اسی دلچسپی کے نتیجے میں ''باغبان'' ڈرامے کی تخلیق عمل میں آئی۔ گھر کے افراد کی جانب سے حوصلہ افزائی اور ہمت افزائی نے ان کے ادبی شوق کو عروج بخشا اور وہ بڑھ چڑھ کر مختلف ادبی وتہذیبی سرگرمیوں میں حصہ لینے لگیں۔ چنانچہ وہ ویمنس کالج میں بی۔ اے کی طالبہ تھیں اس وقت انہیں بزم اتحاد طلبہ کلیہ اناث، جامعہ عثمانیہ کے ممتحن کا عہدہ سونپا گیا اور وہ اس کالج کے زیر اہتمام منعقد کردہ تہذیبی وادبی پروگراموں میں ایک فعال کردار ادا کیا۔

زینت ساجدہ کی ادبی وتہذیبی سرگرمیوں میں حصہ داری طلبہ پر بھی اثر انداز ہوئی۔ چنانچہ جب ۱۹۴۷ء میں ان کا تقرر بحیثیت لکچرر ہوا، ان کی کاوشوں اور کوششوں کے نتیجے میں طلبا کا بھی رجحان ادبی سرگرمیوں کی طرف مائل ہوا۔ وقار خلیل زینت ساجدہ کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''مس لینل ، ویمنس کالج کی پرنسپل تھیں ۔ان دنوں کالی داس کا ڈرامہ 'شکنتلا' اسٹیج کیا گیا اور یوم غالب منایا گیا۔ان کلچرل سرگرمیوں میں زینت ساجدہ نے بھی نمایاں کردار ادا کیا اور حیدرآباد کے علمی و ادبی حلقوں سے داد و تحسین حاصل کی۔[1]

اسی سلسلے مین وقار خلیل یوں ذکر کرتے ہیں:

''جس زمانے میں زینت ساجدہ بی۔اے کی طالبہ تھیں اس وقت ویمنس کالج 'گولڈن تھریشولڈ' میں قائم تھا جو 'بلبل ہند' سروجنی نائیڈو کی اقامت گاہ تھی۔ یہاں سروجنی نائیڈو کی صاحبزادی مس لیلامنی نائیڈو، مسز آغا، سلامت النساء بیگم، محترم جہاں بانو نقوی جیسے اساتذہ نے طلباء کے فکر و نظر کو ان کی صلاحیتوں کے مطابق روشن کیا۔''[2]

زینت ساجدہ کی ذہنی صلاحیتوں کو فروغ دینے میں ان کے اساتذہ کا اہم کردار رہا ہے جو آزادی نسواں کی پرزور حمایت کرتے تھے اور زینت ساجدہ پر ان کے نظریات کا براہ راست یا بالواسطہ طور پر اثر پڑنا لازمی تھا۔ان تمام عناصر نے زینت ساجدہ کی صلاحیت کو عروج بخشا اور اپنی فعال شخصیت کی بنیاد پر اپنے شاگردوں کے درمیان بھی عزیز ہوتی گئیں۔ان کی ادبی و تہذیبی سرگرمیوں میں دلچسپی اور فعال صلاحیتوں نے طلبہ کی تربیت میں بھی چار چاند لگا دیئے اور ویمنس کالج کی کلچرل سرگرمیاں بطور مثال پیش کی جانے لگیں۔

ترقی پسند ادیبوں نے جہاں آزادی نسواں کو اہمیت دی وہیں زندگی کے مختلف مسائل کو بھی اپنی تحریر میں جگہ دی۔ان ادیبوں نے اپنے قلم کو مخصوص انداز میں استعمال کرتے ہوئے دوسرے قلمکاروں کو بھی ایک نئی زندگی کے لیے متحرک کر دیا۔زینت ساجدہ کی تحریروں پر اظہار خیال کرتے ہوئے وقار خلیل لکھتے ہیں:

''زینت ساجدہ کی دانست میں زندگی کے مسائل پر ترقی پسند قلم کاروں نے ماضی

۱۔ وقار خلیل، ڈاکٹر زینت ساجدہ سے ادبی گفتگو، پونم (زینت ساجدہ نمبر)، حیدرآباد، جون۔جولائی ۱۹۸۳ء، ص ۹۱

۲۔ وقار خلیل، ڈاکٹر زینت ساجدہ سے ادبی گفتگو، پونم (زینت ساجدہ نمبر)، حیدرآباد، جون۔جولائی ۱۹۸۳ء، ص ۹۲

سے کہیں بڑھ چڑھ کر لکھا ہے۔ پریم چند نے اردو فکشن کو عارضی کہانی کا تصور دیا ہے اور اسی تصور کی کامیاب ترسیل ترقی پسندوں کی رہین منت ہے۔ ترقی پسندوں کے بعد آج جو کہانیاں لکھی جارہی ہیں وہ بے سمت اور بے چہرہ کہانیاں ہیں۔ ڈاکٹر ساجدہ نے اس امر پر زور دیا کہ جب ایک دور ختم ہوتا ہے تو نیا دور شروع ہوتا ہے اچھا کہانی نویس یاداشت کے طریق پر کہانی کے فن کو روشن کرتا ہے، عہد حاضر میں اس کی مثال قرۃ العین حیدر کی کہانیاں ہیں جو نوسٹیلجک کہانی کی تعریف میں آتی ہے۔ ترقی پسند دور کی شاعری بھی محترمہ کی نظر میں زندگی کے مسائل کا روشن اظہار رہی ہے۔''[1]

۱۹۴۷ء میں جنگ آزادی کی ہنگامہ آرائی نے حیدرآباد کی فضا کو بھی منتشر کر دیا۔ ۱۹۵۶ء میں جب نیا دستور بنا اور اس جمہوری دستور کے آئینہ میں قلمکاروں نے اس جمہوری نظام کے تحت اپنے اظہار خیال کی آزادی کو محسوس کیا اور اسی سال انجمن ترقی اردو تنظیم کی تشکیل نو کا وجود عمل میں آیا۔ اختر حسن اس وقت کے روزنامہ ''پیام'' کے مدیر تھے۔ ان کا مکان بھی ترقی پسند مصنفین کا ادبی مرکز ہوا کرتا تھا اور وہیں پر مختلف جلسوں کا انعقاد عمل میں لایا جاتا تھا۔ اس محفل میں نظر حیدرآبادی، تحسین، سلیمان اریب، یوسف ناظم، شاہد صدیقی، انور عنایت اللہ، عالم خدمیری، مخدوم محی الدین، حسینی شاہد اور زینت ساجدہ شریک ہوا کرتے تھے۔ ۱۹۵۰ء میں جب انجمن ترقی اردو کی تنظیم جدید عمل میں آئی تو زینت ساجدہ نے اس میں بخوبی کردار نبھایا اور ابتدائی دور سے ہی وہ اس انجمن کی ایک فعال رکن رہیں اور تمام سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔

انجمن کے ہر پروگرام، جلسے، تقاریر اور تحریک میں زینت ساجدہ کی شمولیت ہوا کرتی تھی۔ زینت ساجدہ کی شخصیت اس دور کی ادبی دنیا میں جانی پہچانی شخصیت تھی۔ اسی مقبولیت، فعالیت اور ذہانت کی بنیاد پر انہیں آندھرا پردیش ساہتیہ اکیڈمی کے رکن کے طور پر نامزد کیا گیا اور ان کو ''حیدرآباد کے ادیب'' جیسا تذکرہ مرتب کرنے کا کام سپرد کیا گیا اور اس کام کو انہوں نے بہ حسن خوبی پایہ تکمیل تک پہنچایا۔ دو جلدوں

[1] وقار خلیل، ڈاکٹر زینت ساجدہ سے ادبی گفتگو، پونم (زینت ساجدہ نمبر)، حیدرآباد، جون۔ جولائی ۱۹۸۳ء، ص ۹۲

پر مشتمل یہ تذکرہ (اینتھولاجی) حیدرآباد کے ادیبوں کی مختصر سوانح اور ان کی منتخب تخلیقات کا احاطہ کرتا ہے۔انجمن ترقی اردو کی جانب سے ہونے والے جلسوں کی سالانہ رپورٹ اس بات کی مصداق ہے کہ زینت ساجدہ کا ان پروگرامس میں ایک فعال رول رہا ہے۔۱۹۷۸ء کی سالانہ رپورٹ کے مطابق ۲۴ر ستمبر ۱۹۷۸ء کو منعقد ادبی اجلاس کی صدارت زینت ساجدہ نے ہی کی تھی۔جس میں محترمہ بانو طاہرہ سعید نے ''مہ لقا چندا بائی'' پر مقالہ اور محترمہ نجمہ نکہت نے افسانہ پیش کیا تھا۔

۱۹ر اکتوبر ۱۹۷۸ء کو سلیمان خطیب کی یاد میں ایک پروگرام منعقد کیا گیا جس میں زینت ساجدہ نے خطیب کی شخصیت اور فن پر پر مغز تقریر کی اور اسی دوران مرزا ظفر الحسن کی دو کتابوں ''دکن اداس ہے یاروں'' اور ''عمر گزشتہ کی کتاب'' کا رسم اجراء بھی عمل میں آیا۔زینت ساجدہ نے اس میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور برصغیر کے اس ممتاز ترقی پسند شاعر کو خراج تحسین پیش کیا۔ڈاکٹر لئیق صلاح لکھتی ہیں:

> ''افتتاحی تقریر آپا کی تھی انہوں نے شخصیت اور ان کے فن کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہوئے کہا:'پہلے کے شعرا فارسی میں عشق کیا کرتے تھے اور اردو میں شاعری لیکن فیض نے انگریزی میں عشق کیا اور اردو میں شعر کہتے ہیں۔' اس جملے کی بے پناہ داد ملی اور اردو ہال تالیوں سے گونج اٹھا فیض بھی دیر تک اپنے مخصوص انداز میں مسکراتے اور لطف اندوز ہوتے رہے۔'' [۱]

علمی اور ثقافتی سرگرمیوں میں اپنی فعالیت کی بنا پر ادبی دنیا میں زینت ساجدہ کا نام ایک روشن ستارہ کے مانند ابھرا اور لوگوں کے درمیان بہت مقبول رہیں۔بقول اکرام جاوید:

> ''زینت ساجدہ ایک فرد کا نہیں بلکہ جامعہ عثمانیہ اور حیدرآباد کی تہذیبی اور تمام علمی و ادبی اور ثقافتی روایات کا نام ہے۔'' [۲]

زینت ساجدہ کو عوام و خواص میں مقبولیت ان کے ہنگامہ پسند مزاج کی وجہ سے حاصل ہوئی۔وہ ہجوم میں رہنا پسند کرتی تھیں اور وہ اپنے مقابل کی آنکھوں کو پڑھنے کا فن بھی رکھتی تھیں جو عام آدمی کے

۱۔ لئیق صلاح، یادوں کے دیئے، پونم (زینت ساجدہ نمبر)، حیدرآباد، جون۔جولائی ۱۹۸۳ء، ص ۷۹

۲۔ اکرام جاوید، زینت ساجدہ اور انکے افسانے کا ایک جائزہ، پونم (زینت ساجدہ نمبر)، حیدرآباد، جون۔جولائی ۱۹۸۳ء، ص ۵۳

لیے ایک مشکل عمل ہے۔ چنانچہ عاتق شاہ لکھتے ہیں:

''مخدوم محی الدین کے بعد زینت کی ہی وہ شخصیت ہے جسے عوام وخواص میں یکساں مقبولیت حاصل ہے۔ زینت کے بغیر حیدرآباد کے کسی علمی، ادبی اور تہذیبی جلسے کا تصور ممکن نہیں۔ یہی نہیں بلکہ زینت شادی بیاہ کی تقاریب اور میت کے جلوس میں بھی اس اہتمام کے ساتھ ہوتی ہیں جیسے کسی ادبی جلسے میں۔ فرق بس اتنا ہے کہ وہ یہاں تقریر نہیں کرتیں بلکہ خاموش گواہ کی حیثیت میں سب کچھ دیکھتی رہتی ہیں اس لیے شدت سے اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ زینت کے اندر چھپی ہوئی آرٹسٹ جاگ رہی ہے۔''[1]

زینت ساجدہ مخدوم سوسائٹی سے وابستہ رہیں اور بحیثیت صدر اپنی خدمات کو انجام دیا۔ ممتاز یار الدولہ ٹرسٹ کی ٹرسٹی بھی رہیں۔ اس کے علاوہ وہ مینیجنگ کمیٹی ممتاز کالج کی ممبر رہیں۔ آل انڈیا ریڈیو دہلی کی ایڈوائزری کمیٹی کی ممبر، اردو ماڈل اسکول، حمایت نگر کی ممبر، معظم جاہی مارکٹ اسکول کی مینیجنگ کمیٹی کی ممبر، کشٹ جوئی مہیلا سنگم، حیدرآباد کی نائب صدر بھی رہیں۔ ابوالکلام آزاد اورینٹل ریسرچ کمیٹی کی ممبر، نائب صدر محفل خواتین آندھرا پردیش اور اسٹیٹ سنٹرل لائبریری کی مینیجنگ کمیٹی کی ممبر رہ چکی ہیں۔

ترقی پسند تحریک سے وابستگی

مخدوم محی الدین کی قیادت میں جولائی /۱۹۴۵ء میں مخصوص جاگیردارانہ نظام میں ترقی پسند تحریک کا آغاز ہوا۔ اس سے قبل یہ تحریک ہندوستان کے مختلف علاقوں میں ایک نئی تحریک کے طور پر ابھر کر سامنے آئی تھی اور ادیبوں اور شاعروں کے درمیان اس کی مقبولیت میں دن بہ دن اضافہ ہو رہا تھا۔ یہ تحریک اپنے نظریاتی سرمایہ کی بدولت حیدرآباد کے کسانوں اور مزدوروں میں کافی مقبول ہوئی جس کا اعزاز مخدوم محی الدین کو حاصل ہے۔ کسانوں اور مزدوروں کو متاثر کرنے کے علاوہ اس تحریک نے متوسط طبقے کے لوگوں کو بھی متحرک کیا اور لوگ اس تحریک کی حمایت میں آواز بلند کرنے لگے کیونکہ حیدرآباد میں اردو کو سرکاری زبان کا درجہ حاصل تھا اور ترقی پسندوں کی اس تحریک کو وسعت بخشنے میں اردو زبان نے نمایاں کردار ادا کیا۔

[1] عاتق شاہ، ایک آواز ایک تاثر، پونم (زینت ساجدہ نمبر)، حیدرآباد، جون۔ جولائی ۱۹۸۳ء، ص ۲۸

مخدوم محی الدین نے عوامی تحریک کے ذریعہ نہ صرف اس تحریک کومضبوطی اور استحکام بخشا بلکہ اپنی عوامی شاعری کے ذریعے بھی سرمایا دارانہ نظام کے خلاف جدوجہد کی۔ لیکن بیشتر صورتوں میں یہ ممکن نہیں تھا کہ ترقی پسند واضح طور پر حیدرآباد کی مطلق العنان حکومت کے خلاف آواز بلند کرسکیں۔ چنانچہ ۱۹۴۵ء میں منعقد حیدرآباد کے ترقی پسند ادیبوں کی کانفرنس میں جوش ملیح آبادی کے حیدرآباد سے ''شہر بیدر'' کے خلاف قرارداد مذمت پیش ہوئی تو حیدرآباد کے ترقی پسندوں نے اس بنیاد پر اس کی مخالفت نہ کی کہ اس کی وجہ سے انہیں ریاست میں کام کرنے میں بہت سارے مسائل درپیش ہوں گے اور اس تنظیم پر پابندی عائد کردی جائے گی۔ جس کی وجہ سے ترقی پسندوں کو بہت مشقت و پریشانی کا سامنا کرنا پڑے گا۔

یہ دور زینت ساجدہ کا طالب علمی کا دور تھا جس کی وجہ سے ان کا اور ان کے شوہر شاہد حسینی کا نام اس کانفرنس کے کارکنوں میں نظر نہیں آتا ہے حالانکہ انہوں نے اس کانفرنس میں ایک سامع کی حیثیت سے ضرور شرکت کی تھی لیکن ابھی ان کو وہ مقام حاصل نہیں تھا کہ ان کو سجاد ظہیر، کرشن چند کے درجے میں شامل کیا جائے اور اس ترقی پسند کانفرنس کا ذکر کرتے ہوئے ان کا نام لیا جائے۔ لیکن یہ وہی دور تھا جب زینت ساجدہ ایک خاتون افسانہ نگار کی حیثیت سے اپنی ادبی صلاحیتوں کا لوہا منوا رہی تھیں اور آہستہ آہستہ اپنی ارتقائی منزل کی جانب گامزن تھیں۔ ۱۹۴۷ء میں انکا پہلا مجموعہ ''جلترنگ'' شائع ہوکر مقبول ہو چکا تھا۔

۱۹۴۸ء کا وہ دور جب حیدرآباد میں سیاسی ہلچل نے قیامت برپا کردی اور ''پولیس ایکشن'' نے عام زندگی کو درہم برہم کردیا اور ساتھ ہی ساتھ ادبی دنیا بھی بری طرح اس کی زد میں آ گئی۔ اس دور میں مخدوم محی الدّین کو کسانوں اور مزدوروں کے درمیان کافی مقبولیت حاصل تھی۔ زینت ساجدہ مخدوم کے ترقی پسند نظریات اور خیالات سے بہت متاثر تھیں اور خود حسینی شاہد بھی ترقی پسند خیالات اور افکار کے حامی تھے۔

زینت ساجدہ بھی آہستہ آہستہ ترقی پسند تحریک سے وابستہ ہوتی گئیں اور حیدرآباد میں ترقی پسند ادیبوں کے ساتھ جلسوں اور محفلوں میں شرکت کرنے لگیں۔ پھر تلنگانہ تحریک کا آغاز ہوا اور کمیونسٹ رہنما

روپوش ہوگئے۔ زینت ساجدہ چونکہ تدریسی پیشے سے وابستہ تھیں اوران کا شمار مزدوروں یا کسانوں میں نہیں ہوتا تھا اس لئے ان کو بہت زیادہ مشکلات کا سامنا نہیں کرنا پڑا لیکن ترقی پسند نظریات کی حامی ہونے کی وجہ سے انہیں اپنے ساتھیوں کی مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔ یہی وہ گہما گہمی کا دور تھا جب زینت ساجدہ کی زبان سے لفظوں کے شعلے برسنے لگے اور حق بات کو بیان کرنے میں انھوں نے بہت بے باکی اور حاضر جوابی سے کام لیا۔ ان کی یہ حق گوئی و بے باکی اور الفاظ میں کڑواہٹ عمر کے آخری ایام تک قائم رہی۔

زینت ساجدہ کو جہاں حق گوئی، بے باکی اور مزاج میں خودداری کی بنا پر بے پناہ شہرت ومقبولیت نصیب ہوئی اس کے برعکس کئی مقامات پر ان کو خسارہ بھی سہنا پڑا اگرچہ وہ یونیورسٹی میں بطور لکچرر تدریسی فرائض کو انجام دے رہی تھیں لیکن بے پناہ صلاحیتوں کے باوجود بھی ترقی کی منزل نہ طے کرسکیں اور یہی صورتحال حسینی شاہد کے سامنے بھی پیش آئی ان کے لیے یونیورسٹی کی ملازمت کے سارے راستے بند کردیے گئے۔ حسینی شاہد مختلف کالجوں میں پارٹ ٹائم اپنی خدمات کو انجام دیتے رہے۔ اردو آرٹس کالج کا قیام عمل میں آنے کے بعد انہیں وہاں پناہ ملی۔ زینت ساجدہ بھی بہ مشکل ریڈر کے عہدہ تک پہنچ سکیں لیکن کبھی وہ یہ سوچ کر مایوس نہیں ہوئیں کہ انہیں بلند عہدہ ورتبہ نہ مل سکا۔ حقیقت یہ ہے کہ انہوں نے اپنی راہوں کو خود محدود کیا تھا۔ انہوں نے اپنے خوددار رویہ کو ملازمت کے آخری دنوں تک قائم رکھا اور اپنی ذات کو عہدے کے لیے کبھی بھی کسی کے سامنے جھکنے نہ دیا۔ بقول ڈاکٹر مجاور حسین:

> ''حضرات کچھ افراد ایسے ہوتے ہیں کہ اعزاز، منصب، عہدہ، کرسی ان کی شخصیت کو وقار عطا کرتی ہے۔ مگر کچھ ایسی شخصیتیں بھی ہوتی ہیں جو اپنی ذات سے اعزاز کو بلندی و رفعت اور اعتبار عطا کرتی ہیں۔ زینت ساجدہ بھی ایسی ہی شخصیت ہیں۔'' [1]

زینت ساجدہ کو وظیفے پر علیحدگی سے دو سال پہلے صدر شعبہ اردو (عثمانیہ یونیورسٹی) مقرر کیا گیا۔ انہوں نے بحیثیت صدر اپنے فرائض بخوبی انجام دیا۔

[1] ڈاکٹر مجاور حسین، جب تک چار مینار ہاتھ اٹھائے مصروف دعا رہے، پونم (زینت ساجدہ نمبر)، حیدرآباد، جون۔ جولائی ۱۹۸۳ء، ص ۴۰

وفات

زینت ساجدہ اپنی عمر کے آخری ایام میں سخت بیماری میں مبتلا ہوئیں اوران کومہاویر ہاسپٹل میں داخل کرایا گیا۔ وہ تقریباً بارہ۔تیرہ دنوں تک ہاسپٹل کے آئی۔سی۔یو میں رہیں۔بالآخر''دکن کی سانولی'' کے نام سے جانی جانے والی دکن کی یہ معتبر افسانہ نگار،انشاپرداز اورنقّاد ۴/دسمبر ۲۰۰۸ء بروز جمعرات کو اپنے مالک حقیقی سے جاملیں۔

شخصیت

شخصیت

لفظ شخصیت بہت ہی وسیع مفہوم رکھتا ہے۔ انسان کی سیرت و کردار سے ہی شخصیت کی تعمیر ہوتی ہے۔ لفظ ''شخصیت'' کو انگریزی میں ''PERSON'' کہتے ہیں جو لاطینی لفظ ''PERSONA'' سے اخذ کیا گیا ہے جس کا مفہوم وہ مکھوٹا یا مصنوعی چہرہ ہے جو ڈرامے کے کردار ڈرامہ کرتے وقت چہرے پر لگاتے ہیں گویا اس سے ظاہری شکل وصورت مراد لی جاتی ہے۔ فرخ جاوید اس کے معنیٰ یوں لکھتے ہیں:

> ''لفظ شخصیت (پرسن) اصل میں لاطینی 'پرسونا' سے اخذ کیا گیا ہے جس کا مطلب ایسے نقاب سے ہے جو بطور مصنوعی چہرے پر استعمال کیا جاتا ہے۔ گویا 'پرسونا' کا مطلب ظاہری شکل وصورت اور عمل وحرکات ہے۔'' [1]

لیکن جب ہم کسی فرد کی مکمل شخصیات کا ذکر کرتے ہیں تو اس فرد کی ظاہری و باطنی خصوصیات کا مجموعہ ہوتی ہے جس میں اس فرد کے رہن سہن، عادات واطوار، سیرت و کردار جیسے تمام نفسیاتی اور جسمانی عوامل شامل ہوتے ہیں اور فرد کے اندر یہ خصوصیات وراثتاً منتقل ہوتی ہیں یا پھر ماحول سے پیدا ہوتی ہیں۔

زینت ساجدہ کی شخصیت کی تعمیر میں بھی ان کے خاندانی ماحول اور موروثی اثرات کا عمل دخل ہے۔ چونکہ وہ صوفی خانوادے سے تعلق رکھتی تھیں اور اعلیٰ خانوادے کی تعلیم وتربیت نے ان کی شخصیت کی نشوونما میں اہم کردار ادا کیا ہے جس کی وجہ سے وہ نہ صرف ایک نیک صفت انسان بنیں بلکہ ایک ممتاز اور صاحب طرز انشا پرداز، افسانہ نگار اور مایہ ناز استاد اور نقاد بھی بنیں۔

زینت ساجدہ کی شخصیت کا جب ہم مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں ان کی شخصیت کے مختلف پہلو نظر آتے ہیں۔ ان کی شخصیت میں شریف النفسی، مہمان نوازی، اخلاص ومحبت اور حق گوئی جیسی صفات نظر آتی ہیں۔ وہ ہر کسی سے محبت وخلوص سے ملتیں تھیں جس کی وجہ سے ان کے حسن سلوک کا ہر کوئی قائل ہو جاتا تھا۔

---

[1] فرخ جاوید، عمرانیات، ص ۹۵

ان کی شخصیت کے بارے میں ممتاز حبیب ایک مضمون میں یوں رقم طراز ہیں:

''زینت کی شخصیت کے مختلف پہلو ادبیت، سخن شناسی، سخن نوازی، استاذیت وغیرہ وغیرہ منظر عام پر ہیں۔ بہت سارے دوستوں نے ان کی شخصیت کے اور پہلوؤں یعنی جرأت، بے باکی، صداقت، ہمدردی، صلہ رحمی، فرائض شناسی کو بھی اجاگر کر دیا ہے۔ یہاں تک ان کی نجی زندگی کے بعض پہلوؤں کو بھی پبلیسٹی دے دی۔ یوں تو زینت بذات خود کھلی کتاب ہیں ان کا ظاہر و باطن ایک ہے بلکہ میں کہوں گی کہ باطن ظاہر سے بھی اچھا ہے۔'' [1]

خدوخال:

زینت ساجدہ میانہ قد کی تھیں۔ جوانی کے دنوں کے مقابلے بعد کے دنوں میں ان کا بدن دہرا ہو چکا تھا۔ تیکھے نقوش اور گہری بڑی بڑی آنکھیں جن سے فراست ٹپکتی تھی ان خوبصورت آنکھوں کا حسن و موٹے چشمہ کی وجہ سے پھیکا ہو گیا تھا۔ ان کی شخصیت کا سحر ان کے خدوخال سے زیادہ ان کی مجموعی تاثر میں ظاہر ہوتا ہے چہرے کا رنگ سانولا ہونے کی مناسبت سے انہیں ''دکن کی سانولی'' کے خطاب سے نوازا گیا۔

زینت ساجدہ میک اپ سے نا آشنا علم کے زیور سے آراستہ مشرقی طرز کی خاتون میں بلا کی قوت اظہار تھی۔ ان کی مسکراہٹ معنی خیز ہوتی تھی اور دلفریب بھی۔ وہ جس ادبی محفل میں شرکت کرتی تھیں وہاں کا سارا ماحول دلکش اور پرکشش ہو جاتا تھا۔ لفظوں کا صحیح انتخاب اور فقروں کا صحیح استعمال ان کی شہرت و مقبولیت کا راز تھا۔ ان کا رکھ رکھاؤ ان کی شائستہ مزاجی کی ترجمانی کرتا ہے۔

انداز گفتگو

زینت ساجدہ نہایت ہی جداگانہ انداز گفتگو رکھتی تھیں۔ ان کے لب و لہجے میں نرمی تھی اور انداز پرخلوص ہوتا تھا۔ زینت ساجدہ کے بارے میں یہ مشہور ہے کی وہ سنتی کم ہیں اور بولتی زیادہ ہیں۔ جب عام قسم کی بھی بات کرتی ہیں تو سامنے والے کو یہ محسوس ہوتا کہ وہ کہانیاں سنا رہی ہیں کیوں کہ زینت ساجدہ کا

---

[1] ممتاز حبیب، زینت ایک دوست، پونم (زینت ساجدہ نمبر)، حیدرآباد، جون۔جولائی ۱۹۸۳ء، ص ۴۹۔۵۰

ماننا تھا کہ کہانی سننا اور سنانا ایک نیچرل امر ہے اور کہانی انکے خون میں شامل تھی۔ وہ اپنی بات چیت کے دوران مذکر صیغہ کا استعمال کرتی تھیں۔ چنانچہ ان کے انداز گفتگو کے بارے میں عاتق شاہ لکھتے ہیں:

> ''پہلی ملاقات میں زینت آپ سے اس طرح بات کریں گی کہ جیسے وہ آپکو برسوں سے جانتی ہیں۔ گفتگو اور لب و لہجہ نرم ہوگا اور انداز پرخلوص اور سرپرستانہ۔ آپ بڑے احترام اور سعادت مندی سے زینت کو سنیں گے اور جب لوٹیں گے تو آپ کو احساس ہوگا کہ آپ نے صرف ایک اچھے سامع ہونے کا ثبوت دیا ہے۔'' [1]

سیرت و کردار

شخصیت کی صورت گیری میں خاندان، ماحول اور تعلیم و تربیت کا اہم رول ہوتا ہے۔ چنانچہ زینت ساجدہ کی سیرت اور کردار پر روشنی ڈالنے سے پہلے ان کے صوفی گھرانوں کو مدنظر رکھنا ضروری ہے جو دینی علوم کے ساتھ ساتھ اسلامی اقدار کا بھی پاسدار تھا۔ اس علمی گھرانے کی تعلیم و تربیت نے زینت ساجدہ کی نشو ونما میں اہم کردار ادا کیا۔ دیانتدارانہ برتاؤ کا وصف بھی اسی سادات اور صوفی گھرانے سے آیا۔ ان کے اندر یہ صفت ہے کہ وہ نہ کسی کو برا کہتی تھیں اور نہ برا دیکھنے کی عادی تھیں۔ مذہبی فرائض کی ادائیگی میں انہوں نے کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ عاتق شاہ ان کی شخصیت میں دینداری اور حق گوئی کی صفات پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں لکھتے ہیں:

> ''میں شاید یہ بتانا بھول گیا کہ زینت بے حد مذہبی خاتون ہیں۔ ماہ رمضان میں پورے روزے رکھتی ہیں اور باقاعدگی کے ساتھ نمازیں پڑھتی ہیں۔ یہی نہیں بلکہ گیارہ مہینوں کی نماز بھی اس مہینے میں پڑھ کر حساب چکتا کر دیتی ہیں۔ کسی کو برا کہتی ہیں نہ برا دیکھتی ہیں۔ البتہ زینت ان افراد سے بے حد الرجک ہیں جو پدما بھوشن اور پدما شری قسم کے ٹائٹل رکھے ہیں یا جو کھدر پہنتے ہیں یا پھر کسی یار جنگ بہادر کی اولاد ہیں۔ زینت انہیں کبھی نہیں بخشتیں۔'' [2]

---

[1] عاتق شاہ، ایک آواز ایک تاثر، پونم (زینت ساجدہ نمبر)، حیدرآباد، جون۔ جولائی ۱۹۸۳ء، ص ۳۱

[2] عاتق شاہ، ایک آواز ایک تاثر، پونم (زینت ساجدہ نمبر)، حیدرآباد، جون۔ جولائی ۱۹۸۳ء، ص ۳۱

زینت ساجدہ کی حق گوئی کو لوگ ان کی کمزوری سمجھتے ہیں جس کی وجہ سے وہ کسی کو خاطر میں نہیں لاتی تھیں اور اسی بنا پر بہت سے لوگوں نے انہیں گھمنڈی کے خطاب سے بھی نوازا ہے اور بہت سے لوگوں نے انہیں بڑی دیندار اور مذہبی خاتون مانا ہے۔ چنانچہ اس سلسلے میں راج بہادر گوڑ لکھتے ہیں:

''کچھ ایسے بھی ہیں جو زینت سے خفا ہیں۔ الجھے الجھے سے رہتے ہیں۔ وہ کہیں گے مضمون یہیں سے شروع ہو، زینت بڑی گھمنڈی ہے، کسی کو خاطر میں نہیں لاتی۔ نہ اوپر والوں کی چاپلوسی کرتی ہے اور نہ نیچے والوں کو ڈانٹ ڈپٹ کرتی ہے۔۔۔ کوئی کہے زینت بڑی دیندار، مذہبی بلکہ مولوی قسم کی عورت ہے۔ لیکن کوئی اور کہے گا: جی نہیں! بڑی بے باک اور پھکّڑ ہے۔ بھری محفل میں کچھ بھی کہہ دیگی اور اچھے اچھوں کا دل توڑ دے گی۔ رکھ رکھاؤ کی، جسے صاف ستھری زبان میں 'مکاری' اور نستعلیق زبان میں مصلحت کہا جاتا ہے، زینت قائل نہیں ہیں اور یہی اسکی کمزوری ہے کہ جس کی وجہ سے اکثر لوگ اس سے ناراض ہیں تو اکثر لوگ اسی بنا پر اسے ٹوٹ کر چاہتے ہیں۔'' [۱]

زینت ساجدہ ترقی پسند تحریک سے وابستہ ہونے کے ساتھ ساتھ کمیونسٹ نظریہ سے بھی قربت رکھتی تھیں اور باوجود اسکے انہوں نے مذہبی اقدار کو درکنار نہیں کیا بلکہ مذہبی اقدار کو سینے سے لگاتے ہوئے ایک سچی مسلمان ہونے کا ثبوت دیا۔ چنانچہ بیگ احساس لکھتے ہیں:

''آپا ترقی پسند ہیں کمیونسٹ گروپ سے قریب ہوتے ہوئے بھی پکی اور سچی مسلمان ہیں، سیدزادی ہونے پر فخر کرتی ہیں۔ اس بات پر تاسف بھی کرتی ہیں کہ ایسی شخصیتیں کم ہوتی جارہی ہیں جو شفقت اور محبت سے لوگوں کو گرویدہ بنا سکیں۔'' [۲]

سادگی وانکساری

زینت ساجدہ بحیثیت انسان بڑی روادار اور محبت کرنے والی شخصیت تھیں۔ سادگی اور انکساری

۱۔ ڈاکٹر راج بہادر گوڑ، بھرے گھر کی بہو، پونم (زینت ساجدہ نمبر)، حیدرآباد، جون۔ جولائی ۱۹۸۳ء، ص۲۰

۲۔ بیگ احساس، زینت آپا، پونم (زینت ساجدہ نمبر)، حیدرآباد، جون۔ جولائی ۱۹۸۳ء، ص۸۶

ان کی شخصیت کے اہم جز ہیں۔ وہ کبھی اپنے چھوٹوں کو ''تو'' کہہ کر مخاطب نہیں کرتی تھیں۔ حتیٰ کہ وہ گھر کے ملازمین کو بھی عزت بخشتی تھیں اور دیکھنے والا مالکن اور ملازمین کے درمیان تفریق نہیں کر پاتا تھا۔ چنانچہ عاتق شاہ لکھتے ہیں:

> ''زینت کو دیکھنے کے بعد یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ سادگی کسے کہتے ہیں ملنے کے بعد شرافت کا مفہوم واضح ہوجاتا ہے۔ اور گفتگو کے بعد زندگی کے معنی کسی چھپے ہوئے راز کی طرح منکشف ہوجاتے ہیں اسی لئے زینت ان تمام چیزوں سے عبارت ہیں۔'' [1]

زینت ساجدہ نے جب تدریسی پیشے کو اختیار کیا تو انہوں نے سادگی کو اپنی شخصیت کا ایک شعار بنا لیا کیونکہ تدریسی پیشہ ایک پاکیزہ پیشہ ہے اور ایک استاد کی شخصیت طلبہ کے لئے نمونہ ہوتی ہے۔ شاید یہی وجہ تھی کی زینت ساجدہ آرائش و زیبائش سے دور رہتیں اور زندگی کے ہر معاملے میں بھی بہت سادگی اختیار کرتی تھیں۔ ان کی سادگی کے بارے میں لئیق صلاح لکھتی ہیں:

> ''غالب پڑھاتے پڑھاتے سادگی و پرکاری کو انھوں نے اپنا شعار بنالیا ہے، بہت ہی بے تکلفی سے جب گفتگو ہوتی تو ہم ان کی حد سے بڑھی ہوئی سادگی پر دبی زبان سے اعتراض کرتے وہ ہنس کر ٹال جاتیں۔ ایک دفعہ کہنے لگیں میں نے مشورہ دیا کہ کبھی کبھی میک اپ بھی کر لینا چاہیے کچھ دن بعد ہماری بات کو دہراتے ہوئے کہنے لگی تمہارے مشورے پر ہم نے ایک دفعہ عمل کیا لیکن جب آئینہ کے سامنے گئے تو یوں محسوس ہوا کہ وہ 'ہم' نہیں۔'' [2]

غرض زینت ساجدہ ایک سادہ لوح شخصیت کی مالک تھیں۔ انھوں نے اپنے آپ کو بہت زیادہ آرائش و زیبائش سے ہمیشہ دور رکھا اور سادگی و انکساری کو اپنی شخصیت کا لازمی جز بنایا۔

۱۔ عاتق شاہ، ایک آواز ایک تاثر، پونم (زینت ساجدہ نمبر)، حیدرآباد، جون۔ جولائی ۱۹۸۳ء، ص ۳۱

۲۔ لئیق صلاح، یادوں کے دیئے، پونم (زینت ساجدہ نمبر)، حیدرآباد، جون۔ جولائی ۱۹۸۳ء، ص ۷۸

شہرت ونام ونمود سے دوری

زینت ساجدہ خوددار شخصیت کی مالک تھیں۔انہوں نے کبھی بھی عہدہ یا اعزاز یا شہرت ومقبولیت کے لئے خوشامد پسندی کا سہارا نہیں لیا۔انہیں اپنے خوددار رویہ کی وجہ سے ترقی کی راہ میں بہت مشکلات کا سامنا کرنا پڑا اور اس کا خمیازہ بھی بھگتنا پڑا۔انہوں نے ایسی صورت حال کا بھی سامنا کیا ہے کہ ان کے شوہر حسینی شاہد کے لیے یونیورسٹی نے ملازمت کے سارے دروازے بند کردیئے تھے اس مشکل دور میں بھی زینت ساجدہ نے اپنی وضع داری کو قائم رکھا اور بے لوث خدمات انجام دیتی رہیں۔چنانچہ ڈاکٹر مجاور حسین لکھتے ہیں:

> ''حضرات کچھ افراد ایسے ہوتے ہیں کہ اعزاز ، منصب، عہدہ،کرسی ان کی شخصیت کو وزن اور وقار عطا کرتی ہے مگر کچھ ایسی شخصیتیں بھی ہوتی ہیں جو اپنی ذات سے اعزاز کو بلندی و رفعت عطا کرتی ہیں۔زینت ساجدہ بھی ایسی ہی شخصیت ہیں۔'' [1]

خلوص ومحبت اور حق گوئی

زینت ساجدہ نہایت ہی شریف مزاج کی مالک تھیں۔انہوں نے بڑی سادگی اور انکساری کے ساتھ اپنی زندگی کو گزارا۔وہ کسی سے بھی بغض وعداوت نہیں رکھتی تھیں اور ہر کسی کے ساتھ خلوص سے پیش آتی تھیں۔وہ عوام وخواص کی عزت کرتی تھیں شاید اسی وجہ سے ان کو عوام وخواص میں شہرت ومقبولیت حاصل تھی۔کسی کی برائیوں اور غلطیوں کو وہ اس کے سامنے ہی بیان کردیتی تھیں بھلے ہی سامنے والے شخص کو گراں گزرے۔

زینت ساجدہ نے عمر کے آخری ایام تک سبھی کے ساتھ یکساں سلوک و برتاؤ کیا اور بہت خوبصورتی وخلوص کے ساتھ ہر رشتے کو نبھایا۔چنانچہ اے۔جی فاروقی لکھتے ہیں:

> ''زینت ساجدہ کا سب سے بڑا وصف ان کی وضع داری ہے جسے وہ ہر شخص کے ساتھ اس خوبی سے نباہتی ہیں کہ بے شمار ماہ وسال گزرنے کے بعد بھی اس میں

[1] ڈاکٹر مجاور حسین، جب تک چار مینار ہاتھ اٹھائے مصروف دعا رہے، پونم (زینت ساجدہ نمبر)،حیدرآباد، جون۔جولائی ۱۹۸۳ء،ص ۴۰

ذرا فرق نہیں آتا۔ یہ ان کی پر خلوص شخصیت اور پختگی کردار کی دین ہے۔" [1]

معاصرین کے ساتھ برتاؤ

زینت ساجدہ کا رویہ اپنے معاصرین کے ساتھ دوستانہ رہا ہے۔ انہوں نے حسد و جلن سے خود کو ہمیشہ دور رکھا اور بڑی فراخ دلی اور خلوص کے ساتھ سبھی سے ملتی تھیں۔ اپنی حق گوئی اور بے باکانہ انداز کی وجہ سے لوگوں کی عزیز رہیں۔ وہ ہمیشہ کسی بھی صلہ اور نام و نمود سے دور رہتے ہوئے ادب کی خدمت کرتی رہیں۔

زینت ساجدہ کا حلقہ احباب بہت وسیع تھا، جس میں ہر طرح کے لوگ شامل تھے۔ انکے احباب کی فہرست میں راج بہادر گوڑ جیسے تجربہ کار سیاستدان اور مخدوم جیسے نڈر رہنما اور شاعر اور سرینواس لاہوٹی جیسے اردو نواز بھی شامل تھے۔ ان کے علاوہ اختر شاہ خان اور امیر علی خان جیسے اساتذہ بھی شامل تھے۔ زینت ساجدہ بالخصوص انہیں لوگوں سے زیادہ قریب رہیں جو ترقی پسند تحریک سے وابستہ تھے۔ اسکے علاوہ اردو ادب سے وابستہ اشخاص بھی ان کے احباب میں شامل تھے۔ زینت ساجدہ کے احباب ان کی بہت عزت کرتے تھے۔

راج بہادر کے ساتھ زینت ساجدہ کے گہرے مراسم تھے۔ راج بہادر گوڑ انہیں بنیادی طور پر ٹیچر ہی سمجھتے تھے۔ زینت ساجدہ کی شخصیت پر بحیثیت استاد دوستوں کی غلطیوں کی نشاندہی کرنے کی عادت تھی اسی عادت کا ذکر کرتے ہوئے بڑے لطیف انداز میں راج بہادر گوڑ ایک جگہ لکھتے ہیں:

> "ایک روز دیکھئے نا میرے گھر آگئیں میری میز پر سے وہ خط اٹھالیا جو میں نے اپنی بیوی کو لکھا تھا. پہلے تو دوسروں کا خط پڑھنا ہی معیوب بات ہے پھر آپ مجھ سے مخاطب ہو کر کہنے لگیں: یہ خط تمہارا ہے؟ اتنی غلطیاں؟ یہاں املا غلط ہے یہاں جذبے کی نزاکت ایک نرم آواز والا لفظ چاہتی ہے یہ ثقیل لفظ گراں گزرتا ہے پھر تم نے 'نے' کا استعمال کیوں نہیں کیا؟ میں نے جواب دیا 'جناب میں

[1] اے۔ جی فاروقی، زینت ساجدہ، پونم (زینت ساجدہ نمبر)، حیدرآباد، جون۔ جولائی ۱۹۸۳ء، ص ۴۷

نے اپنی بیوی کو خط لکھا ہے کسی زبان دانی کے امتحان کا پرچہ نہیں لکھا ہے۔'' ۱؎

زینت ساجدہ کے مزاج میں نرمی و مروّت بہت زیادہ تھی لیکن غلطیوں اور برائیوں کو دیکھ کر خاموش رہ جانا ان کی صفات میں شامل نہیں تھا۔ بے با کی اور حاضر جوابی کی وجہ سے وہ اپنے جذبات کو فوراً ظاہر کر دیتی تھیں۔ اپنے ایک ارادت مند دوست شاعر س۔ا۔عشرت کے شعری مجموعے پر زینت ساجدہ نے مقدمہ لکھا جس کے بارے میں عاتق شاہ لکھتے ہیں:

''چنانچہ میرے ایک شاعر دوست بھی خوش تھے کہ ان کے پہلے شعری مجموعے پر زینت ساجدہ نے مقدمہ لکھا ہے کئی بار انہوں نے اپنی مسرت کا اظہار کیا اور مجھ سے میری رائے پوچھتے رہے۔ میں ہمیشہ مسکرا کر ٹالتا رہا لیکن جب وہ مصر ہو گئے تو میں نے کہا زینت نے تمہاری شاعری اور فن کے بارے میں ایک فقرہ بھی نہیں لکھا۔ بڑی خوبی سے تمہیں ٹال گئیں اور خود کو یہ کہہ کر بچا لیا کی کہ میں دوستوں کے عیوب پر نظر نہیں ڈالتی ورنہ تمہاری خیر نہ تھی۔ باقی جو بھی لکھا اس میں تمہاری شخصی نالائقیوں کا ذکر ہے اور اس میں یہ بتایا ہے تم نے اپنا سفر عابد روڈ سے شروع کیا تھا معظّم جاہی مارکٹ پہنچ کر ٹھہر گئے اور پینتیس سال سے اس کے اطراف گھوم رہے ہو یہ کوئی تعریف نہیں دکھایا گیا ہے کہ تم کہاں واقع ہو۔'' ۲؎

زینت ساجدہ نے اپنے دوستوں کے ساتھ مثالی رویہ اپنایا اور ان کی کمزوریوں کو قبول کرتے ہوئے اس رشتے کو بخوبی نبھایا۔ انہوں نے کبھی بھی کسی چیز کے لیے سمجھوتا نہیں کیا اور نہ ہی کبھی موقع پرستی سے کام لیا۔ دوستوں کے ساتھ ان کے رویے کا ذکر کرتے ہوئے ممتاز حبیب لکھتی ہیں:

''میں نے کہیں پڑھا تھا کہ دوست کی پہچان یہ ہے کہ آپ بے دھڑک اس کے سامنے کہے جائیں۔ موزوں یا ناموزوں بات، اچھی یا بری ہر قسم کی بات بلا جھجک اور بے سوچے ہوئے۔ سچا دوست اس ذخیرہ کو دماغی طور پر پر چھلنی کر لیتا ہے اور اصل رکھ کر باقی ردّی دان کے حوالے کر دیتا ہے۔ اتنے طویل عرصے میں

۱؎ ڈاکٹر راج بھادر گوڑ، بھرے گھر کی بہو، پونم (زینت ساجدہ نمبر)، حیدرآباد، جون۔ جولائی ۱۹۸۳ء، ص ۲۰

۲؎ عاتق شاہ، ایک آواز ایک تاثر، پونم (زینت ساجدہ نمبر)، حیدرآباد، جون۔ جولائی ۱۹۸۳ء، ص ۲۷

میں نے زینت کو ایسا ہی پایا ہے۔اور ایسا کرنے میں وہ ایک برابری والے
انسان کے مانند ہوں گی۔ انہوں نے کبھی اپنے کو دوستوں سے کسی بھی میدان
میں اونچا نہیں سمجھا، ہر ایک کی منفرد صلاحیت کو خندہ پیشانی اور کھلے دل سے
مانا۔کمزوریوں کو قبول کیا اور پورے خلوص کے ساتھ دوستی نباہی۔'' [1]

ہمدردی وخلوص

زینت ساجدہ مشرقی اقدار کی پاسدار خاتون تھیں۔ وہ بڑے خلوص وحمیت کے ساتھ لوگوں سے پیش آتیں۔ بڑوں کا ادب واحترام، چھوٹوں سے محبت ومشفقانہ برتاؤ اور دوست واحباب کے ساتھ مخلصانہ رویہ رکھتی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ سب ان سے محبت کرتے اور ان کا احترام کرتے تھے۔ وہ نادار اور ضرورت مند طالب علموں کی بے لوث مدد کرتی تھیں۔ حسب ضرورت انہوں نے کئی ضرورت مند طلبہ کی فیس کی ادائیگی خود کی۔ ان کی شخصیت میں مروت، ہمدردی اور خلوص بہت تھا جس کی وجہ سے وہ کسی بھی حاجت مند کو خالی نہیں لوٹاتی تھیں۔ وہ اپنے گھر کے ملازمین سے گھر کے افراد جیسا رویہ اختیار کرتی تھیں۔ زینت ساجدہ کے انسانی رشتوں کے برتاؤ کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ان کے گھر ایک دفعہ ایک ملازم نے اپنی اداسی کا سبب بتاتے ہوئے یہ ظاہر کیا کہ اس کی بیٹی کی شادی کی تاریخ مقرر ہو چکی ہے لیکن ابھی تک شادی کی تیاریاں نہیں ہوئی ہیں اور جیسے جیسے شادی کے دن قریب آرہے ہیں اس کی مشکلات میں اضافہ ہوتا جارہا ہے کیوں کہ اس کے پاس ایسے وسائل نہیں ہیں جس سے وہ اپنی بیٹی کو بطور جہیز کچھ ضروری سامان دے سکے اپنے ملازم کی زبانی اس کا یہ حال سن کر زینت ساجدہ کی آنکھیں نم ہو گئیں اور انہوں نے اپنے ملازم کو یہ تسلی دلائی کی اللہ کارساز ہے کوئی نہ کوئی حل ضرور نکل آئے گا۔ پھر انہوں نے اپنی جان پہچان کے لوگوں سے بات کر کے اس کی بیٹی کی شادی کے سارے اخراجات کا بندوبست کیا۔ زینت ساجدہ نے اس حدیث پر عمل کیا کہ ُسیدھے ہاتھ کی خیرات کا علم بائیں ہاتھ کو بھی نہ ہوٗانہوں نے اسی اصول کو اپنی زندگی میں نافذ کر لیا تھا۔

---

[1] ممتاز حبیب، زینت ایک دوست، پونم (زینت ساجدہ نمبر)، حیدرآباد، جون۔جولائی ۱۹۸۳ء، ص ۵۰

بحیثیت استاد

زینت ساجدہ ایک بلند پایہ ادیب ہونے کے ساتھ ساتھ ایک قابل قدر استاد بھی تھیں۔ انہوں نے نئی نسل کی تعمیر و ترقی، انسانیت کی نشونما اور معاشرے کی تعمیر تشکیل اور انسانی فلاح و بہبود میں ایک کامیاب معلم کا کردار ادا کیا ہے۔ انہوں نے اپنے طلبہ کے ساتھ ایک خوشگوار تدریسی فضا کو ہموار کیا۔ ان کی تدریس سے طلبہ بہت زیادہ متاثر تھے۔ انہوں نے طلبہ کے اندر تخلیقی فکر پیدا کرنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ ان کا شمار ہندوستان کی یونیورسٹیوں میں پڑھانے والے بہترین اساتذہ میں ہوتا تھا۔ وہ تمام تدریسی مواد کو دلائل کے ساتھ طلبہ کے سامنے پیش کرتی تھیں اور وہ اس کے روشن و تاریک دونوں پہلو کو زیر بحث لاتیں۔ چنانچہ عاتق شاہ لکھتے ہیں:

> ''ڈرامے کے علاوہ زینت نے غالب بھی پڑھایا اور ذاتی طور پر میں نے یہ تاثر کو قبول کیا تھا۔ یہ غالب بڑے کام کی چیز ہیں اور انہیں بار بار پڑھنا چاہیے۔ اس تاثر کو میں ایک اچھی ٹیچر کی دین سمجھتا ہوں اور میرا خیال ہے کہ زینت صرف ہماری یونیورسٹی کی نہیں بلکہ ہندوستان کی تمام یونیورسٹیوں میں اردو پڑھانے والے ان ٹیچروں میں سے ایک ہیں جنہوں نے طلبہ کو تخلیقی فکر عطا کی۔'' [1]

زینت ساجدہ نے اپنے تدریسی فرائض کی ادائیگی کے دوران ایک مثالی کردار ادا کرتے ہوئے طلبہ کے ساتھ نہایت شرافت، نیک دلی اور شفقت کا مظاہرہ کیا۔ ان کا یہ مثالی کردار طلبا کی شخصیت سازی اور کردار سازی میں انہوں نے ایک مثالی استاد کا کردار نبھایا۔ وہ طلبہ کی صلاحیتوں کے فروغ کے لیے ان کی بھرپور حوصلہ افزائی کرتی تھیں اور طلبہ کے تخلیقی حسن کو مزین کرنے اور اسکو بلند معیار عطا کرنے میں انہوں نے پوری ایمانداری اور خلوص کے ساتھ اپنی ذمہ داری کو انجام دیا۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر مجاور حسین لکھتے ہیں:

> ''انہوں نے تینتیس (۳۳) برس کی تدریسی زندگی کو ایک روشن کتاب کی طرح نمونہ عمل بنا کر پیش کیا۔ مشرقی تہذیب کے اعلیٰ ترین معیار کو اپنا کر انہوں نے

---

[1] عاتق شاہ، ایک آواز ایک تاثر، پونم (زینت ساجدہ نمبر)، حیدرآباد، جون۔ جولائی ۱۹۸۳ء، ص ۲۹

شرافت، نیک نفسی، بے نیازی اور اپنی شفقتوں سے طالب علموں کی حوصلہ افزائی کر کے ان کی زندگیاں سنواری ہیں۔ عام طور پر استاد کے سامنے کچھ لکھ کر لے جایئے تو سننا پڑتا ہے: غلط یہ لفظ، وہ بندش بری۔ یہ مضمون سست۔ مگر ڈاکٹر زینت ساجدہ کے پاس لے جایئے تو صحیح یہ لفظ، یہ بندش درست، یہ مضمون چست سننے کو ملے گا۔ وہ حوصلہ افزائی فرماتی ہیں دل بڑھاتی ہیں۔ ذرّہ کو آفتاب کا ہم پایہ بنا دیتی ہیں۔ یہ حوصلہ افزائی ان کے کردار کا اہم ترین جزو ہے۔'' [۱]

زینت ساجدہ کا تدریسی انداز بالکل جدا تھا۔ وہ جب طلبہ کو نوٹس لکھاتی تھیں تو ان کے ہاتھ میں کسی بھی طریقے کا کوئی نوٹس نہیں ہوتا تھا۔ بلکہ وہ براہ راست کسی بھی عنوان پر روانی کے ساتھ بولتی جاتی تھیں اور یہ عمل اس بات کا شاہد ہے کہ انھیں اردو ادب پر عبور حاصل تھا۔ چنانچہ عاتق شاہ ان کے پڑھانے کے انداز کی ستائش کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''مجھے یاد ہے ڈرامے کی ایک کلاس میں طلبہ کی اکثریت نے زینت سے ڈرامے پر چند نوٹس لکھوانے کی خواہش کی۔ پہلے تو زینت نے انکار کیا پھر راضی ہوگئیں اور کہا لکھیے۔

سب اپنی دانست میں یہ سمجھ رہے تھے کہ زینت کہیں نہ کہیں سے کوئی نوٹ بک برآمد کریں گی اور اسے کھول کر کسی صفحے سے لکھوانا شروع کریں گی لیکن زینت نے ایسا نہیں کیا بلکہ شروع ہوگئیں اور مسلسل پچاس یا پچپن منٹ تک بولتی رہیں بالکل ایسے ہی جیسے کوئی اچھا اسکالر کسی سمینار میں پیپر پڑھتا ہے، ایک متوازن لب ولہجہ اور متوازن رفتار کے ساتھ۔'' [۲]

زینت ساجدہ جب بھی کسی غزل یا کسی مضمون کو پڑھاتیں تو وہ اسکو ماحول کے ساتھ مطابقت کرتے ہوئے طلبہ تک پیش کرتی تھیں۔ انہوں نے اپنی تدریسی صلاحیتوں کی بدولت ہی روزمرہ کی زندگی کے مشاہدات و تجربات کو تدریسی آلے کے طور پر استعمال کیا اور تدریس کو موثر بنانے کی کوشش کی اور اس

۱۔ ڈاکٹر مجاور حسین، جب تک چار مینار ہاتھ اٹھائے مصروف دعا رہے، پونم (زینت ساجدہ نمبر)، حیدرآباد، جون۔ جولائی ۱۹۸۳ء، ص ۳۹

۲۔ عاتق شاہ، ایک آواز ایک تاثر، پونم (زینت ساجدہ نمبر)، حیدرآباد، جون۔ جولائی ۱۹۸۳ء، ص ۲۹

میں کامیابی بھی حاصل کی۔لئیق صلاح ان کی تدریسی صلاحیتوں پر بحیثیت شاگرد روشنی ڈالتے ہوئے لکھتی ہیں:

''غالب کو ہم نے بغیر شرح کے پڑھا اور سمجھا ہے یقیناً یہ زینت آپا کا طفیل ہے۔تشریح اس قدر مکمل اور مفصل ہوتی کی تشنگی کا احساس نہیں رہتا۔معمولی اور روزمرّہ کے تجربات ومشاہدات کا سہارا لے کر بڑے بڑے مسائل اور نکتے بیان کر جاتیں۔ایک اور خوبی یہ ہے کہ یہ جس شخصیت کو انہوں نے چھوا اس کا نقش طالب علم کے دل پر ثبت ہو گیا۔'' ۱

زینت ساجدہ کو تدریسی پیشہ میں مہارت ہونے کے ساتھ ساتھ وہ ایک بہترین رہنما اور اصلاح کار بھی تھیں۔انہیں تدریس سے اتنا گہرا لگاؤ تھا کہ جب بھی کوئی شاعر یا تخلیق کار اپنا کلام یا مضمون ان کو سونپتا تو وہ اصلاح کے ذریعے اس مضمون کو سنوارنے کی کوشش کرتیں اور بطور رہنما ان کی تخلیق کو بھی سنا کرتیں اور غلطیوں کی نشاندہی کرتی جاتیں۔چنانچہ ڈاکٹر راج بہادر گوڑ ان کی اصلاح کرنے کی صلاحیت کو لطیف پیرائے میں یوں بیان کیا ہے:

''زینت چاہے بہت کچھ ہوں لیکن میں اسے بنیادی طور پر ٹیچر اور مدرس سمجھتا ہوں۔اس کو تدریس سے عشق اور ٹیچری کی عادت پڑی ہوئی ہے۔کسی شاعر نے اپنے کلام کا مجموعہ دیا۔پڑھتی ہے تو ہاتھ میں پینسل ہوگی۔یہاں مصرع وزن سے گرتا ہے، یہ لفظ بحر سے خارج ہے، یہ شعر غزل کی مجموعی فضا سے ہم آہنگ نہیں، یہاں یہ لفظ نہ ہو اور اس کے بجائے دوسرا لفظ ہو تو شعر اور بھی حسین ہو جائے گا۔غرض مجموعہ کلام کا قیمہ بن جائے گا۔'' ۲

زینت ساجدہ اپنے شاگردوں کی اصلاح کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے ہم عصر ادیبوں کی بھی حسب ضرورت اصلاح کیا کرتی تھیں لیکن اصلاح کا انداز حوصلہ افزائی کا ہوتا نہ کہ نکتہ چینی کا۔اس سلسلے میں لئیق صلاح لکھتی ہیں:

۱۔ لئیق صلاح، یادوں کے دیئے، پونم (زینت ساجدہ نمبر)، حیدرآباد، جون۔جولائی ۱۹۸۳ء، ص ۷۷

۲۔ ڈاکٹر راج بھادر گوڑ، بھرے گھر کی بہو، پونم (زینت ساجدہ نمبر)، حیدرآباد، جون۔جولائی ۱۹۸۳ء، ص ۲۰

''آپا کی یہ خاص بات ہے کہ کوئی معمولی شاعر، افسانہ نگار اور انشاء پرداز بھی جب اپنی کوئی تخلیق ان کو سناتا ہے تو بڑے انہاک اور دلچسپی سے سنا کرتی ہیں اور غلطیوں کی کچھ اس انداز میں تصحیح کرتی جاتی ہیں کہ سنانے والے کو گراں نہ گزرے بلکہ اس میں حوصلہ پیدا ہوتا جائے۔'' ۱؎

زینت ساجدہ غالبؔ سے بہت زیادہ متاثر نظر آتی ہیں۔تدریس کے دوران بھی وہ غالب کے اشعار کو طلبہ کے سامنے پیش کیا کرتی تھیں۔غالب کے ایک ایک شعر کا معنیٰ ومفہوم بڑے ہی مفصل انداز میں اسطرح بیان کرتی تھیں کہ سننے والے کی دلچسپی بڑھ جاتی تھی۔چنانچہ رفیع رؤف لکھتی ہیں:

''آپا کی غالبؔ فہمی اور غالبؔ شناسی کے معاملے میں ایک بات میں پوری ذمہ داری سے کہہ سکتی ہوں کہ آپ غالب پر لکھی ہوئی تمام کتابیں بجز یادگار غالبؔ کے ساری کی ساری پڑھ ڈالیے۔خواہ وہ غالبؔ نامہ ہو کہ ذکر غالبؔ یا محاسن کلام غالبؔ ہو کہ آہنگ غالبؔ وغیرہ۔ایسی بیسوں کتابیں آپ پڑھ لیجئے اور پھر اس کے بعد آپا سے غالب پڑھنے آیئے ایک ایک شعر کی تہ سے معنیٰ و مفہوم کے ایسے آبدار موتی نکال لائیں گی کہ آپ دریائے حیرت میں غرق نہ ہو جائیں تو ہمارا ذمہ۔'' ۲؎

زینت ساجدہ نے اپنے تدریسی پیشے کے تئیں ذمہ دارانہ خدمات کو انجام دیا۔ان کے بارے میں یہ مشہور ہے کہ وہ وقت کی پابند نہ تھیں اور وقت کی پابندی کرنا شاید ان کی فطرت میں شامل نہیں تھا۔لیکن انہوں نے اپنے اس تدریسی خدمات کو بہت ہی ایمانداری اور ذمہ داری سے انجام دیا۔وہ ہمیشہ وقت پر کلاس میں پہنچتی تھیں اور ان دنوں میں بھی پڑھانے پہنچ جاتی تھیں جب ان کی کلاس نہیں ہوا کرتی تھی۔ جب وہ کلاس شروع کرتیں ہیں تو ختم کرنے کا کوئی متعین وقت نہیں ہوتا تھا کبھی کبھی انھوں نے ایوننگ کالج میں رات کے دس اور گیارہ بجے تک تدریسی عمل کو انجام دیا ہے۔چنانچہ بحیثیت استاد زینت ساجدہ کی شخصیت کی جامع تعریف کرتے ہوئے بیگ احساس لکھتے ہیں:

۱؎ لئیق صلاح، یادوں کے دیئے، پونم (زینت ساجدہ نمبر)، حیدرآباد، جون۔جولائی ۱۹۸۳ء، ص ۸۰

۲؎ رفیع رؤف، مباش منکر کہ در زمانہ تست، پونم (زینت ساجدہ نمبر)، حیدرآباد، جون۔جولائی ۱۹۸۳ء، ص ۲۷

''خدا بعض انسانوں کو بناتے وقت ان کے ضمیر میں کسب کی ایک بوند ملا دیتا ہے۔اور ایسے انسان اپنے پیشے کی علامت بن جاتے ہیں۔آپا بھی ایک ایسی ہی علامت ہیں۔استاد کے تمام اوصاف گنوانے کے بجائے صرف ایک نام' زینت ساجدہ' لکھ دیا جائے تو استاد کی اس سے اچھی، جامع اور مختصر تعریف نہیں ہوسکتی۔'' [۱]

حق گوئی

زینت ساجدہ حق بات کو بڑی بے باکی سے لوگوں کے سامنے پیش کرنے کی جسارت بھی رکھتی تھیں۔ڈاکٹر لئیق صلاح نے ایک واقعہ کے حوالے سے ایک جلسے میں ان کی شرکت اور بحیثیت مقرر بڑی بے باکانہ انداز میں چیف منسٹر سے محو گفتگو ہونے کے انداز کی تعریف کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

''آپا نے چیف منسٹر کو مخاطب کر کے کہا کہ اگر آپ کو کسی کام سے جانا ہو تو براہ کرم میری تقریر شروع ہونے سے پہلے ارادہ کریں تا کہ میں یکسوئی کے ساتھ تقریر جاری رکھ سکوں چیف منسٹر رک گئے اور آپا نے تقریر شروع کی کوئی دس پندرہ منٹ بعد چیف منسٹر پہلو بدلنے لگے۔آپا کی نظر پڑی تو چیف منسٹر کو مخاطب کر کے کہا آپ تکلف کر رہے میں دو منٹ کے لئے رکتی ہوں، آپ سدھاریں۔ڈاکٹر چنا ریڈی مرد آہن مانے جاتے ہیں اور بڑے دبدبے کے آدمی ہیں۔ان کے سامنے منہ کھولتے ہوئے اچھے اچھے گھبراتے ہیں یہ آپا کا دل تھا کہ بھرے جلسے میں صاف گوئی سے نہ چوکیں۔'' [۲]

کچھ ایسی صورت حال اس وقت بھی پیدا ہوگئی جب چنا ریڈی نے مخدوم ایوارڈ کے جلسے میں شرکت کی تھی۔لئیق صلاح لکھتی ہیں:

''یہ وہ زمانہ تھا جب چنا جب چنا ریڈی حکومت کی جڑیں کھوکھلی ہو رہی تھیں۔آپا صدر مخدوم ایوارڈ کمیٹی کی حیثیت سے خیر مقدمی تقریر کر رہی تھیں۔انہوں نے کہا، ڈاکٹر صاحب کے بارے میں آجکل دو رائیں پائی جاتی ہیں۔کوئی انہیں اچھا

۱۔ بیگ احساس، زینت آپا، پونم (زینت ساجدہ نمبر)، حیدرآباد، جون۔جولائی ۱۹۸۳ء، ص ۸۴

۲۔ لئیق صلاح، یادوں کے دیئے، پونم (زینت ساجدہ نمبر)، حیدرآباد، جون۔جولائی ۱۹۸۳ء، ص ۷۹

آدمی کہتا ہے اور کوئی برا لیکن میں نہیں جانتی کی وہ اچھے ہیں یا برے۔اس لئے کہ ان سے کبھی سابقہ نہیں پڑا۔کبھی کسی غرض سے ان کے ہاں گئی نہیں۔ہاں میرا اور انکا ایک رشتہ ہے اور وہ ہے اردو کا رشتہ۔وہ عثمانین ہیں،اردو والے ہیں اور اردو کے لیے کچھ کام بھی کیے ہیں اس لئے میں سمجھتی ہوں وہ اچھے آدمی ہوں گے۔تو ڈاکٹر چنا ریڈی نے اپنی تقریر کے دوران زینت آپا کو مخاطب کرتے ہوئے یقین دلایا کہ وہ اچھے آدمی ہی ہیں۔" [1]

زینت ساجدہ کی اس حق گوئی اور بے باکی کا اعتراف کرتے ہوئے اس جلسے میں ہا گا ریڈی نے انہیں "پولیس پٹیل" کا خطاب دیا تھا۔زینت ساجدہ کی اس جسارت اور بے باکی کی ستائش بھی ہوئی اور تنقید بھی لیکن ان کا جو رویہ تھا وہ ویسا ہی رہا۔

بے باکی اور حق گوئی زینت ساجدہ کی شخصیت کے اہم جز ہیں اور زینت ساجدہ کی انہیں خصوصیات کی بنا پر ان کو ان ادیبوں کی فہرست میں رکھا جاتا ہے جنہوں نے حق گوئی اور بے باکی کو اپنی زندگی کا شعار بنایا۔ڈاکٹر راج بہادر گوڑ لکھتے ہیں:

"زینت کا شمار میں ہندوستان کی ان گنی چنی لکھنے والی عورتوں میں کرتا ہوں جن کا بے باکی میں جواب نہیں اور جن کے پھکڑ پن سے اچھے اچھوں کے چھکے چھوٹ جاتے ہیں۔امریتا پریتم، عصمت چغتائی، سپالاّ ررنگنا نکما اور زینت ساجدہ ان میں سرفہرست ہیں۔" [2]

زینت ساجدہ کبھی کبھی حق بات بیان کرنے میں تلخ لہجہ کو اختیار کرتے ہوئے سامنے والے پر بالکل سیدھا اور ڈائریکٹ وار کرتی تھیں۔وہ کبھی بھی جھوٹ اور برائی کی حمایت نہیں کرتی تھیں۔اس سلسلے میں ممتاز حبیب لکھتی ہیں:

"نوک جھونک، بحث و تکرار میں حق پسندی، حق گوئی مقصد ہوگی۔جرأت و بے باکی، مصلحت اندیشی کو کوڑے کی ضرب لگائے گی سچ ہمیشہ تلخ ہوتا ہے اور

---

[1] لئیق صلاح، یادوں کے دیئے، پونم (زینت ساجدہ نمبر)، حیدرآباد، جون۔جولائی ۱۹۸۳ء، ص ۷۹۔۸۰

[2] ڈاکٹر راج بھادر گوڑ، بھرے گھر کی بہو، پونم (زینت ساجدہ نمبر)، حیدرآباد، جون۔جولائی ۱۹۸۳ء، ص ۲۰

صداقت میں یقین کی شدت زینت کے لب ولہجہ کو بسا اوقات تلوار کی دھار بنا دیگی۔ ان کی اس صفت نے ان کے طویل تدریسی دور کو اور تصنیف وتالیف کے دور کو تلخ تجربوں سے بھر دیا ہے۔ اسی نے دور والوں کو اور دور کیا ہے وہ کبھی زہر کو قلاقند نہ کہہ سکیں اور نہ چوٹ کو مثال میں لپیٹا ان کا وار سیدھا اور ڈائریکٹ رہا۔'' ۱؎

بحیثیت مقرر

زینت ساجدہ علمی ، ادبی وتہذیبی پروگراموں میں ایک فعال رکن کی حیثیت سے شامل ہوتی رہیں۔ زینت ساجدہ کے بارے میں یہ عام ہے کہ وہ ایک فرد کا نہیں بلکہ جامعہ عثمانیہ اور حیدرآباد کی تہذیبی اور تمام علمی وادبی ثقافتی روایت کا نام ہے۔ وہ اردو ادب کی دنیا میں ایک شعلہ بیان مقرر کی حیثیت سے بھی جانی جاتی ہیں۔ وہ بزلہ سنجی اور حاضر جوابی میں اپنی مثال آپ ہیں۔

زینت ساجدہ کی تقریر کرنے کا انداز بالکل جدا تھا وہ اس متوازن لب ولہجہ اور رفتار کے ساتھ تقریر کرتیں کہ سامعین پوری سعادت مندی کے ساتھ انکی تقریر کو سنا کرتے اور اسے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ پاتے۔ اس سلسلے میں فاطمہ عالم علی لکھتی ہیں:

''میں نے زینت آپا جیسی اسٹیج پر بولنے والی ان سے پہلے دیکھی نہ ان کے بعد کوئی ان جیسا بے ساختہ بولنے والا پیدا ہوا۔ جو لوگ انہیں سن چکے ہیں آج بھی کسی اور کو سنتے ہیں تو کہتے ہیں نہیں بھائی زینت ساجدہ کی بات کہاں۔'' ۲؎

بحیثیت ناظم

زینت ساجدہ نے بہت سے علمی وادبی پروگراموں ومشاعروں میں نظامت کے فرائض بھی انجام دیا ہے اور بہت سے جلسوں میں بحیثیت صدر بھی شرکت کی۔ انہیں کسی پروگرام یا جلسوں کے بگڑتے ماحول کی فضا کو خوشگوار کرنے پر قدرت حاصل تھی۔ اور باتوں باتوں میں سامعین کا دل جیتنے کا فن بھی رکھتی

۱؎ ممتاز حبیب، زینت ایک دوست، پونم (زینت ساجدہ نمبر)، حیدرآباد، جون۔ جولائی ۱۹۸۳ء، ص ۵۱

۲؎ فاطمہ عالم علی، درد تھمے تو بات کریں، اسلوب بیان اور، حیدرآباد، ۲۰۰۹۔ ص ۱۳

تھیں۔اس سلسلے میں اے۔جی فاروقی لکھتے ہیں:

''اکثر مروّت میں آکر زینت ساجدہ ایسے جلسوں کی صدارت قبول کرلیتی ہیں اور انہیں یہ نہیں معلوم ہوتا کہ صدر صاحبہ کو کیا کرنا ہے۔بگڑی ہوئی بات کو وہ جلد بھانپ لیتی ہیں اور بڑی خوش اسلوبی سے چند ایسی بات کہ جاتی ہیں کہ لوگ واہ واہ کرنے لگتے ہیں یہ کرشمہ انکے مزاج اور خود پر ہنس لینے کی صلاحیت کا۔'' [1]

غرض یہ کہ زینت ساجدہ قلم اور زبان دونوں پر عبور رکھتی تھیں۔ان کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ بڑی اچھی منتظم تھیں اور بڑی حسن وخوبی سے نظامت کے فرائض انجام دیتی تھیں۔

بحیثیت بیٹی

زینت ساجدہ متوسط گھرانے میں پیدا ہوئیں اور وہ اپنے والدین کی ایک فرمابردار بیٹی تھیں۔اپنے گھر میں سب سے بڑی ہونے کی وجہ سے خوش خلقی سے اس رشتے کو بڑی ذمہ داری سے نبھاتی رہیں۔انہوں نے اپنے چھوٹے بھائیوں اور بہنوں کو پڑھایا لکھایا اور انہیں سماج میں ایک باعزت مقام دلایا۔وہ چھوٹوں کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آتی تھیں لیکن ان کا رویہ مشفقانہ اور مخلصانہ تھا۔عاتق شاہ لکھتے ہیں:

''زینت کی زندگی کا یہ گوشہ بڑا ہی اہم ہے اور قابل احترام بھی۔اچھے فنکار اور اچھے انسان کی نشانی اور شناخت یہی ہے کہ وہ اپنی نجی زندگی میں بھی ذمہ دار رہے ورنہ وہ فنکار یا شخص جو اپنے ماں باپ، بہن بھائیوں اور قریبی رشتہ داروں سے انصاف نہ کرسکے وہ بھلا اپنے دوستوں یا پڑوسی سے یا قوم سے کیا انصاف کر سکتا ہے؟ اور اس سے کیا توقع کی جاسکتی ہے۔'' [2]

زینت ساجدہ ایک ہمہ جہت شخصیت کی مالک تھیں۔شریف النفسی، ملنساری، محبت و اخلاص، ہمدردی، خودداری، حق گوئی و بے باکی ان کی شخصیت کے اہم اجزا ہیں۔بحیثیت بیوی وہ رشتوں کو

۱۔ اے۔جی فاروقی، زینت ساجدہ، پونم (زینت ساجدہ نمبر)، حیدرآباد، جون۔جولائی ۱۹۸۳ء، ص ۴۷

۲۔ عاتق شاہ، ایک آواز ایک تاثر، پونم (زینت ساجدہ نمبر)، حیدرآباد، جون۔جولائی ۱۹۸۳ء، ص ۳۰

نبھانے والی مشرقی خاتون تھیں۔بحیثیت ماں اپنے بچوں کا خیال رکھنے والی مشفق ومہرباں ماں تھیں ۔ بحیثیت استاد اچھی رہنما و رہبر تھیں ۔اسکے علاوہ دوستوں واحباب کے ساتھ ان کا رویہ بہت اچھا ہوتا تھا۔اچھی مقرر و ناظم بھی تھیں۔غرض زینت ساجدہ شہرت ونام ونمود سے دوری نہ صرف تمام رشتوں کو نبھایا ہے بلکہ اردو ادب کی خاموشی سے خدمت گزاری بھی کرتی رہیں۔یہی وجہ ہے کہ ان کی شخصیت اردو حلقوں میں مرغوب کن رہی۔

باب دوم

زینت ساجدہ کی معاصر خواتین قلمکار

(حیدرآباد دکن کے حوالے سے)

معاصر خواتین قلمکار

شہر حیدرآباد ہمیشہ ہی علم وادب کا مرکز رہا ہے اور اپنی نفیس خصوصیات کی بنا پر ایک منفرد پہچان رکھتا ہے۔ابتداء سے ہی یہ شہر مختلف زبان، تہذیب اور ثقافت کی پاسداری کرتا رہا ہے بالخصوص اردو زبان وادب کی نمائندگی ہوتی رہی ہے۔ یہاں کی سرزمین اردو ادب کے لیے بے حد نفع بخش ثابت ہوئی ہے۔ اردو ادب کے پہلے صاحب دیوان شاعر قلی قطب شاہ کا تعلق بھی اسی سرزمین سے رہا ہے ۔ یہاں کے حکمران بھی اردو ادب سے کافی رغبت رکھتے تھے اور وہ خود صاحب طرز شاعر وادیب تھے انہوں نے اردو ادب کی خدمت گزاری کو اپنا شیوہ بنا لیا تھا۔ان حکمرانوں کے علاوہ شہر حیدرآباد سے بے شمار شعراء وادباء ابھرے جنہوں نے ہر دور میں ادب کی تقریباً تمام اصناف میں طبع آزمائی کرتے ہوئے ادب کے خزانے میں بیش بہا اضافے کئے ہیں۔

عہد آصفیہ سے قبل ہندوستان کے لوگ قدیم روایات کے پابند تھے اور قدامت پسند تھے۔خاص کر حیدرآباد خواتین کی پردہ نشینی کیلئے سخت گیر تھا۔ بیشتر گھرانوں میں خواتین کی پوری دنیا گھر کی چہار دیواری ہی تھی لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ سماجی ماحول میں تبدیلی رونما ہوئی اور قدامت پسندی کا خاتمہ ہونے لگا۔انیسویں صدی میں حیدرآباد میں تحریک نسواں کا آغاز ہوا جس کا اثر معاشرتی اور تمدنی زندگی پر براہ راست یا بالواسطہ نظر آتا ہے۔اس تحریک نے خواتین کے پست حوصلے کو تقویت بخشی جس کی بدولت انہوں نے نہ صرف خود کو تعلیم حاصل کی بلکہ سماجی تنگ نظری کو ختم کرنے کی ہر ممکن کوشش کی اور ساتھ ساتھ حصول علم کے رجحان کو بھی فروغ دیا۔

تحریک نسواں نے بہت سی خواتین قلم کاروں کی حوصلہ افزائی کی۔ شاعری ہو کہ افسانہ نگاری، ناول نگاری ہو یا تنقید وتدریس ہر میدان میں خواتین دکن نے اپنی تخلیقی صلاحیتوں کا لوہا منوایا ہے۔ حیدرآباد کی خواتین قلم کاروں میں جیلانی بانو، عفت موہانی، آمنہ ابوالحسن، رفیعہ منظورالامین، قمر جمالی،

نجمہ نکہت وغیرہ نے اپنی کاوشوں سے اردو نثر کو بلند مقام عطا کرنے میں کوئی کسر باقی نہیں چھوڑی۔ان نثر نگار خواتین نے اپنے فن پاروں کو کسی خاص موضوع تک محدود نہیں رکھا بلکہ تمام موضوعات پر قلم اٹھایا۔ انہوں نے اپنی تخلیقات کے ذریعے اردو ادب میں اپنی ایک منفرد پہچان بنائی ہے۔ناول ہو یا افسانہ ان خواتین قلمکاروں نے عورتوں کے بنیادی مسائل کو موضوع بحث بنایا ہے اوراس کے ذریعہ عورتوں کی تعلیم و تربیت، سماجی و اخلاقی اورمعاشرتی برائیوں کو دور کرنے کی بھی کوشش کی ہے۔ انہوں نے عورتوں کی ناخواندگی کو ہی تمام برائیوں اور خامیوں کی جڑ تسلیم کیا ہے۔عورتوں کا تعلیم یافتہ ہونا ہی ان کی کامیاب زندگی کی ضامن ہے۔اس کے علاوہ انہوں نے سماج کے فرسودہ رسم ورواج کی طرف بھی لوگوں کی توجہ مبذول کرنے کی کوشش کی ہے۔

حیدرآباد کی خاتون نثر نگار نے ناول نگاری، افسانہ نگاری، ادبی اورمزاحیہ مضامین نگاری، تحقیق و تنقید میں اپنی تخلیقات کے ذریعے نام روشن کیا اورادبی دنیا میں شہرت ومقبولیت حاصل کرتے ہوئے اپنا ایک خاص مقام بنایا۔

یہاں ان خواتین افسانہ نگاروں کا اختصار کے ساتھ تعارف پیش کیا جارہا ہے۔

بانو طاہرہ سعید

بانو طاہرہ سعید ملک و بیرون ملک کی شہرت یافتہ اردو فارسی انگریزی کی ممتاز شاعرہ وادیبہ ہیں۔ اس کے علاوہ وہ ایک نقاد اورافسانہ نگار کی حیثیت سے بھی مقبول ہیں۔بانو طاہرہ سعید کی پیدائش ۱۹۲۰ء میں آگرہ میں ہوئی۔تعلیمی مراحل کی تکمیل لکھنؤ وایران میں ہوئی۔لکھنؤ سے بی۔اے کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد بانو طاہرا پنے والدین کے ساتھ تہران چلی گئیں۔بانو طاہرہ کے والدسعیدامیر علی معصومی ایران کے مشہور رئیس تھے۔دولت مند ہونے کے ساتھ ساتھ ان کے خاندان میں علم وادب کا ذوق تھا۔بانو طاہرہ نے ایران میں صحافت کا کورس مکمل کیا اور ریڈیو تہران کے شعبہ اردو میں بحثیت نگراں ومنتظم ذمہ داری کو انجام دیا۔انہوں نے بی۔بی۔سی کی ٹریننگ بھی حاصل کی تھی۔بانو طاہرہ کو مختلف زبانوں مثلاً انگریزی،

فرنچ، فارسی اور اردو پر عبور حاصل تھا۔عربی اور سنسکرت سے بھی واقفیت حاصل تھی۔

بانو طاہرہ کی شادی کرنل سعید کے ساتھ ہوئی اور اس کے بعد وہ حیدرآباد آ گئیں۔ان کو بچپن کے دنوں سے ہی ادب میں دلچسپی تھی۔زمانہ طالب علمی میں ہی ان کو شاہ ایران نے ادبی انعامات سے نوازا تھا۔۱۹۶۱ء میں ملکہ فرح دیبا کی جانب سے فارسی منظومات پر پیام خوشنودی ملا اور ۱۹۷۱ء میں شاہ ایران نے خوشنودی کے ساتھ ''شیریں سخن'' کے لقب سے یاد کیا۔

بانو طاہرہ سعید مختلف ادبی وتہذیبی انجمنوں سے وابستہ رہیں۔ان کے کلام روزنامہ ''سیاست'' کے علاوہ اپنے وقت کے نامور ادبی رسائل میں وقتاً فوقتاً شائع ہوتے رہے۔حیدرآباد دوردرشن اور آل انڈیا ریڈیو پر بھی ان کا کلام نشر ہوتا تھا۔وہ ادارہ ادبیات اردو، انجمن ترقی اردو مجلس کی ساری محفلوں میں پابندی کے ساتھ شرکت کرتی تھیں اور محفل خواتین کے نائب صدر کے عہدے پر بھی فائز رہیں۔انکے شعری مجموعے اور نثری کتابیں فارسی اور انگریزی میں شائع ہوکر مقبول عام ہوچکی ہیں۔ان کی ادبی خدمات کے اعتراف میں ۱۹۵۹ء میں ساہتیہ اکیڈمی کی جانب سے ادبی انعام سے سرفراز کیا گیا۔آندھراپردیش، مغربی بنگال، یوپی اور بہار اردو اکیڈمی نے بھی ان کی تخلیقات پر انہیں ایوارڈ سے نوازا ہے۔منسٹری کلچرل افیرز، قومی یکجہتی، کلا سرسوتی اور مخدوم امن ایوارڈ، امتیاز میر ایوارڈ لکھنؤ بھی حاصل کر چکی ہیں۔

بانو طاہرہ سعید کو نثر و نظم دونوں پر عبور حاصل تھا۔نظم ہو کہ نثر ماحول کی اثر انگیز ترجمانی اور انسانی دردوالم کی کیفیت کا بیان پیدا کر دیتا ہے۔لکھنؤ میں پروان چڑھی زبان کا اثر ان کی تحریر میں چار چاند لگا دیتا ہے۔ ہر صنف میں انہوں نے طبع آزمائی کی ہے۔کئی مختصر وطویل افسانے اردو سے فارسی وتلگو زبان میں ترجمہ ہوکر شائع ہو چکے ہیں۔ان کی ایک نظم کو دنیا کی پچاس بہتر نظموں کے مجموعہ میں شامل کیا گیا ہے۔ انگریزی ادب کی خدمات کے اعتراف میں انہیں امریکہ کی عالمی یونیورسٹی ایریزونا سے ڈی۔لٹ کا اعزاز حاصل ہوا۔ ان کی بعض انگریزی نظموں کو کامن ویلتھ پوسٹ گریجویٹ کورس میں شامل کیا گیا ہے۔۱۹۷۳ء میں ورلڈ پوئٹری سوسائٹی نے انہیں عالمی ایوارڈ سے نوازا۔

بانو طاہرہ سعید کی تصنیفات حسب ذیل ہیں:

ا۔ہدیہ طاہرہ (نعتیہ کلام)،۲۔سات دوست (بچوں کی کہانیاں)،۳۔آشیاں ہمارا (قومی نظمیں)،۴۔دور رہ کر (نثری نظموں کا مجموعہ)،۵۔گل خونچکاں (نظمیں واقعات کربلا)،٦۔برگ سبز (مجموعہ کلام)،۷۔مثبت منفی (ٹاملین کی انگریزی نظموں کا منظوم ترجمہ)،۸۔مہکتے ویرانے،۹۔پینیتھ دی ہاؤ(انگریزی نظموں کا مجموعہ)،۱۰۔خون جگر(افسانوی مجموعہ)۔

بانو طاہرہ سعید کی نظموں کا منظوم تلگو ترجمہ بھی ''ارپنا'' کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ ہر صنف میں ان کی تخلیقات موجود ہیں۔بچپن سے ہی فطری طور پر ان کے اندر نثر و نظم کا ذوق شوق رہا۔شعر گوئی سے طبعی مناسبت کے ساتھ ساتھ انہوں نے نثری اصناف پر بھی توجہ مرکوز کی اور مختلف افسانوں کی تخلیق کی اور بچوں کے لئے کہانیاں بھی لکھیں جو وقتاً فوقتاً شائع ہوتی رہیں۔

بانو طاہرہ سعید کی شاعری میں مزاج کی رنگینی،طبیعت کی شگفتگی اور سلاست و روانی موجود ہے جس کے باعث وہ ہر محفل میں محبوب و مقبول رہا کرتی تھیں۔انہوں نے اپنے عہد کے مسائل کو اپنی شاعری کے ذریعے پیش کیا ہے اور انکا یہ وصف ان کے شعور اور فن کی ترجمانی کرتا ہے۔

شاعری کے علاوہ بانو طاہرہ نے افسانوی میدان میں بھی اپنے قلم کے جوہر دکھائے ہیں اور قارئین کو متاثر کرنے میں کامیاب بھی رہیں۔''خون جگر'' بانو طاہرہ سعید کا افسانوی مجموعہ ہے۔ یہ مجموعہ طویل مختصر افسانہ ''خون جگر'' کے علاوہ آٹھ مختصر افسانوں پر مشتمل ہے جو اس طرح ہیں:

ا۔خون جگر، ۲۔حاجی صاحب،۳۔مسیحا، ۴۔ورد العرب،۵۔ابن آدم،٦۔لیلیٰ کا جوڑا، ۷۔خاتون مصر،۸۔احسان اور ۹۔آغا باجی۔

بانو طاہرہ کا تعلق کسی خاص مکتبہ خیال سے نہیں رہا۔انہوں نے کسی نظریہ یا رجحان سے آزاد ہو کر اپنے اطراف و اکناف کی زندگی اور مسائل کو بڑی سنجیدگی سے بیان کیا ہے۔ان کے افسانوں کے مطالعہ سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ وہ انسانی نفسیات سے بخوبی واقفیت رکھتی تھیں۔ان کے افسانے کے کردار متحرک اور جاندار ہیں۔انہوں نے روزمرہ زندگی کے مسائل کا بڑی گہرائی کے ساتھ مشاہدہ کیا ہے جس کی وجہ سے جذباتی مسائل کی نمایاں جھلک سامنے آتی ہے۔ان کی پر اثر کہانیاں قاری کو عورتوں کی

نفسیات سے روبرو کراتی ہیں۔

بانو طاہرہ سعید نے مختلف النوع موضوعات پر قلم اٹھایا ہے۔ان کے کچھ افسانے رومانی طرز کے ہیں، کچھ سنجیدہ ہیں تو بعض لطیف مزاح سے مزین نظر آتے ہیں۔بعض افسانوں میں انہوں نے حب الوطنی کو موضوع بنایا ہے۔افسانہ ''خاتون مصر'' اس کی ایک بہتر مثال ہے۔بعض افسانوں میں انہوں اپنے زمانے کی فرسودہ روایات کو موضوع بنایا ہے۔

بانو طاہرہ سعید ایک اچھی قصہ گو ہیں۔انہیں ہر طرح کی بات پیش کرنے کی سلیقہ مندی ہے۔ان کے افسانے میں انشائیہ کی سی دلکشی و جاذبیت موجود ہے۔انسانی مسائل کا ادراک اور دردمندی کا جذبہ انکے افسانوں میں نمایاں ہے اور یہی دردمندی بانو طاہرہ سعید کی تحریروں کی بنیادی خصوصیت معلوم ہوتی ہے۔

غرض بانو طاہرہ سعید باغ و بہار شخصیت کی مالک تھیں۔خوش گفتاری و خوش رفتاری ان کی شخصیت کے اہم جز تھے۔ادبی دنیا کی یہ شہرت یافتہ شاعرہ اور افسانہ نگار ۱۷ راگست ۲۰۰۱ء کو دارفانی سے کوچ کر گئیں۔

پروفیسر رفیعہ سلطانہ

پروفیسر رفیعہ سلطانہ کا شمار اردو ادب کی دنیا میں افسانہ نگار، محقق، نقاد اور ہر دلعزیز استاد کی فہرست میں ہوتا ہے۔ادب کی دنیا میں کچھ ایسے چنندہ اساتذہ ادب گزرے ہیں جن کی خدمات کو فراموش نہیں کیا جا سکتا اور بالخصوص یونیورسٹی کی تاریخ میں جن خواتین کا ذکر کیا جائے ان میں پروفیسر رفیعہ سلطانہ کا نام بلند مرتبہ واہمیت کا حامل ہے جنہوں نے نہ صرف عثمانیہ یونیورسٹی کے شعبہ اردو میں بحثیت اردو پروفیسر اپنی خدمات انجام دیں بلکہ فیکلٹی آف آرٹس کی پہلی خاتون ڈین ہونے کا اعزاز بھی انہیں حاصل ہے۔وہ چیئر مین بورڈ آف اسٹڈیز کے عہدے پر بھی فائز رہیں۔

رفیعہ سلطانہ کی ولادت ۲۴ ردسمبر ۱۹۲۴ء کو اورنگ آباد میں ہوئی۔ان کے والد سردار مرزا اورنگ

آباد کے تحصیلدار تھے اور والدہ سر رشتہ تعلیمات سے منسلک تھیں۔ رفیعہ سلطانہ کی تعلیم و تربیت میں انکی والدہ کا ایک اہم کردار رہا۔ ابتدائی تعلیم اورنگ آباد سے حاصل کی اور اورنگ آباد سے ہی ۱۹۴۰ء میں میٹرک کا امتحان پاس کرنے کے بعد وہ حیدر آباد پہنچیں اور ۱۹۴۲ء میں ویمنس کالج، حیدر آباد سے انٹرمیڈیٹ کے امتحان میں کامیابی حاصل کی۔ ۱۹۴۴ء میں جامعہ عثمانیہ سے بی۔اے کامیاب کیا اور پھر ۱۹۴۶ء میں ایم۔اے (اردو) امتیازی حیثیت سے کامیاب کیا۔ انہوں نے اپنا ایم اے کا مقالہ ''اردو ادب کی ترقی میں خواتین کا حصہ'' کے موضوع پر تحریر کیا جبکہ پی۔ایچ۔ڈی کی ڈگری کے لیے انہوں نے ۱۹۵۵ء میں ''اردو نثر کا آغاز اور ارتقاء انیسویں صدی کے اوائل تک'' موضوع پر پروفیسر سروری کی نگرانی میں مقالہ داخل کیا اور ڈگری حاصل کی۔

پروفیسر رفیعہ سلطانہ نے ۱۹۴۷ء میں محبوبیہ گرلس کالج سے ملازمت کی ابتدا کی بعد ازاں ویمنس کالج کے شعبہ فارسی میں اپنی خدمات کو انجام دیں۔ پی۔ایچ۔ڈی کی تکمیل کے بعد شعبہ اردو عثمانیہ یونیورسٹی سے وابستہ ہوئیں۔ ۱۹۵۵ء میں ریڈر ۱۹۵۹ء میں پروفیسرشپ اور صدر شعبہ اردو اور ڈین کے فرائض کو بحسن خوبی انجام دینے کے بعد ۱۹۸۶ء میں ملازمت سے سبکدوش ہوئیں۔ ۲۰۰۷ء میں انکا انتقال ہوا۔

ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ کو بچپن ہی سے اردو زبان و ادب کا ذوق و شوق تھا اور کم عمری سے ہی انہوں نے کہانیاں اور مضامین لکھنا شروع کر دیا تھا۔ ان کی پہلی تصنیف ''حیدر آباد'' ہے جو بچوں کے لیے لکھی گئی تھی۔ انہوں نے افسانہ نگاری کی ابتدا ترقی پسند تحریک کے عروج کے دور میں کی۔ وہ اس تحریک سے متاثر ضرور تھیں لیکن انہوں نے اپنے لئے ایک علیحدہ طرز نگارش اختیار کیا۔ ۱۹۴۹ء میں ان کا پہلا افسانوی مجموعہ ''دھاگے'' شائع ہوا۔ یہ مجموعہ ان کے دلچسپ افسانوں کا مجموعہ ہے جس میں افسانے زیر و بم، نئے پرانے، کچے دھاگے، کھنڈر، بیس سال بعد، بھونرا رسیا، دل ناداں، نور و ظلمت اور رومیو جولیٹ شامل ہیں۔ ان افسانوی کارنامے نے پروفیسر رفیعہ سلطانہ کو ادب کی دنیا میں ایک منفرد مقام عطا کیا۔ ان کے افسانوں کے متعلق نصر الدین ہاشمی کی رائے درست معلوم ہوتی ہے:

''موجودہ دور کے افسانوں کے کرداروں کی بڑی اچھی تصویر کشی کی گئی ہے۔ کردار کے تحت تصور کی کیفیات بھی واضح رکھتی ہیں۔جنسی کشمکش کو بھی پیش کرتی ہیں مگر ساتھ ہی ساتھ عورت کے وقار کو صدمہ ہوتا ہے اور نہ عریانی پائی جاتی ہے۔ مردوں کی مرجائیت کواجاگر کرنے میں ان کا قلم بڑا زور دکھاتا ہے۔''[1]

پروفیسر رفیعہ سلطانہ کی تخلیقی صلاحیتیں ''دورِ چراغ محفل'' میں اور بھی نکھر کر سامنے آئیں۔ یہ ڈرامائی تصنیف دراصل غالب کی حیات اور کارنامے پر مبنی ہے۔تخلیقی صلاحیت ہونے کے ساتھ ساتھ ان کے اندر تنقیدی شعور بھی بدرجہ اتم موجود تھا۔''فن اور فنکار'' اور ''اقبال سخن'' ان کی تنقیدی تصانیف ہیں۔ جس میں انہوں نے اپنے تنقیدی نظریات پیش کیے ہیں۔''اقبال سخن'' میں سادہ سلیس زبان کا استعمال کیا ہے اوران کے شاعرانہ کلام کے ہر پہلو کو پر روشنی ڈالی ہے۔انہوں نے علامہ اقبال کے فکروفن کو قاری کے سامنے لانے کی کوشش کی ہے۔اس کے علاوہ ان کی ایک اور کتاب ''بھکتی مسلک اور اردو شعراء'' ہے جو انگریزی زبان میں لکھی گئی ہے۔ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ نے تخلیق وتنقید کے علاوہ تحقیق وتدوین میں بھی دلچسپی دکھائی۔تحقیق کے لیےانہوں نے قدیم نثر کا انتخاب کیااور تدوین کیلئے نثر ونظم دونوں میں طبع آزمائی کی۔

پروفیسر رفیعہ سلطانہ نے دکنی ادب پر خاص توجہ دی۔اپنی تخلیق وتحقیق کے ذریعے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ اردو علم وادب لازوال خزانوں سے مالا مال ہے۔ان کی کتاب ''اردو نثر کا آغاز وارتقاء ''اردوادب کا ایک بیش قیمتی سرمایہ ہے۔عام طور پر یہ رائے قائم ہے کی اردو نثر کا آغاز فوٹ ولیم کالج سے ہوالیکن پروفیسر رفیعہ سلطانہ نے یہ ثابت کر دیا کہ اس کالج سے قبل بھی بہت سارے نثری کارناموں کا پتہ چلتا ہے۔اس کے علاوہ انہوں نے ایک کتاب ''اردوادب میں خواتین کا حصہ'' لکھااوراسکے ذریعہ اردو زبان وادب کی تاریخ میں خواتین کے کارناموں کا ذکر کرتے ہوئے یہ ثابت کیا کہ خواتین نے بھی اردو ادب کی ترقی میں اہم کردار نبھایا ہے۔

پروفیسر رفیعہ سلطانہ اردوادب کی دنیا میں ایک اہم مقام رکھتی ہیں۔ وہ ایک بڑی محقق اور نقاد تھیں۔انھوں نے اردوادب کووسعت بخشی۔اپنی تحریر میں سادہ اور عام فہم زبان کا استعمال کیا۔وہ ایک خوش

[1] دکن میں اردو کی چھٹی اشاعت،ص ۹۳۰۔۹۳۱

مزاج اور خاکسار مزاج کی مالک تھیں اور یہ صفت ان کے اسلوب میں بھی نظر آتی ہے۔ پروفیسر رفیعہ سلطانہ نے تحقیقی کام کو آسان بنا کر لوگوں میں تحقیق کے ذوق وجذبے کو بیدار کیا اور لوگوں میں ادب اور کلچر سے وابستگی بڑھائی۔

رفیعہ منظورالامین

رفیعہ منظورالامین حیدرآباد کی خاتون افسانہ نگار اور ناول نگار کی حیثیت سے بے حد مشہور ومقبول ہیں۔ رفیعہ منظورالامین کی ولادت ۲۵/ جولائی ۱۹۳۰ء کو حیدرآباد کے ایک تعلیم یافتہ گھرانے میں ہوئی۔ ابتدائی رسمی تعلیم کاچی گوڑہ، حیدرآباد سے حاصل کی۔ ابتدائی تعلیمی مراحل کی تکمیل کے بعد عثمانیہ یونیورسٹی سے بی۔ایس۔سی کی ڈگری حاصل کی۔ ان کے دادا جناب محمد عبدالمجید حیدرآباد کے سول سروس کے پہلے ممبر تھے۔ انہیں انسپکٹر جنرل آف جیلرز کے ساتھ اکاونٹنٹ جنرل، حیدرآباد کا عہدہ سونپا گیا تھا اور ان کے والد محمد عبدالمجید صاحب پولیس ڈیپارٹمنٹ سے وابستہ تھے۔

رفیعہ منظورالامین کی شادی بی۔ایس۔سی مکمل کرنے کے بعد منظورالامین سے ہوگئی جو خود بھی ایک اچھے شاعر وادیب ہیں۔ وہ آل انڈیا ریڈیو میں بحیثیت ڈائریکٹر فائز رہے اور پھر ٹیلی ویژن کے شعبہ سے منسلک رہتے ہوئے بہت کامیابی حاصل کی اور آخر میں ڈائریکٹر جنرل دوردرشن، نئی دہلی کی حیثیت سے خدمات انجام دیتے ہوئے عہدے سے سبکدوش ہوئے۔ منظورالامین صاحب اردو ادب کی دنیا میں خاکہ نگاری کے حوالے سے بھی اپنی ایک منفرد پہچان رکھتے ہیں۔

رفیعہ منظورالامین بچپن سے ہی کہانیاں لکھنے کا ذوق وشوق رکھتی تھیں۔ ان کی پہلی کہانی رسالہ ''پیام تعلیم'' میں دہلی سے شائع ہوئی۔ اس کے بعد بھی چند اور کہانیاں لکھیں۔ انہوں نے اپنے تعلیمی دور میں ادبی وتہذیبی سرگرمیوں میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور کالج میگزین ''کاسماس'' کی ادارت کے فرائض بھی انجام دیے۔ سائنس کی طالبہ ہونے کے سبب ادب کی طرف خاطر خواہ توجہ نہ دے سکیں لیکن انہیں اردو سے حد درجہ دلچسپی تھی۔ رفیعہ صاحبہ اپنے عہد کی کسی بھی تحریک سے وابستہ نہ تھیں کیوں کی وہ خود کو کسی تحریک

سے وابستگی کو ضروری نہیں سمجھتی تھیں، ان کا ماننا ہے کہ اگر کوئی ادیب اتنا حساس ہے کہ زمانے کے بدلتے ہوئے تقاضوں کو محسوس کرتا رہے اور اس کے مطابق اپنے فن کو نکھارتا رہے تو اسے کسی نام نہاد تحریک کے مہمیز کی ضرورت نہیں رہتی۔

منظور الامین صاحب کی ہمراہی نے رفیعہ صاحبہ کے شوق کو جلا بخشی اور ان کی تحریک پر افسانہ نگاری اور ناول نگاری کی طرف توجہ کی۔ علاوہ ازیں مجسمہ سازی، باغبانی، مصوری، فوٹو گرافی اور سیاحت سے انہیں حد درجہ لگاؤ تھا لیکن منظور الامین کی ملازمت کے سبب انہیں مختلف مقامات پر منتقل ہونا پڑتا تھا اور ان تبادلوں نے ان کے شوق کو پنپنے نہیں دیا کیونکہ مجسمہ سازی کا سامان ساتھ ساتھ رکھنا دشوار تھا اس لئے انہوں نے اپنی پوری توجہ تصنیف و تالیف کی طرف مبذول کر دی اور دوسرے مشاغل باغبانی، مصوری، فوٹو گرافی اور سیاحت کا بھی شوق پورا کرتی رہیں۔

رفیعہ منظور الامین بحیثیت ناول نگار، افسانہ نگار، ڈرامہ نگار اور انشائیہ نگار کی حیثیت سے بہت مشہور ہیں۔ اس کے علاوہ سائنس کی طالبہ ہونے کی بناء پر وہ سائنس سے بھی دلچسپی رکھتی تھیں اور سائنسی مضامین کا مجموعہ ''سائنس اور زاویے'' لکھا۔ اس کے علاوہ دیگر سائنسی مضامین، افسانے، اخبارات اور رسائل میں شائع ہوتے رہے۔ ''سارے جہاں کا درد''، ''عالم پناہ'' اور ''یہ راستے'' رفیعہ منظور الامین کے مشہور ناول ہیں، ایک کتاب بچوں کے لئے ''آؤ ناٹک کھیلیں'' لکھیں۔ اس کے علاوہ ان کا مشہور افسانوی مجموعہ ''دستک سی درد دل پر'' ۱۹۸۹ء میں سیمانت پرکاشن، نئی دہلی سے شائع ہوا۔ اس مجموعے میں حسب ذیل چوبیس افسانے شامل ہیں:

۱۔ تنگا منی، ۲۔ مات، ۳۔ ایک نگاہ کا زیاں، ۴۔ فرشتے، ۵۔ کون، ۶۔ کھوئی راہوں کے سفر، ۷۔ اپنی اپنی صلیب، ۸۔ ناگ پھنی کا کھیت، ۹۔ حرف آگہی، ۱۰۔ چپ، ۱۱۔ ٹینی بار پر، ۱۲۔ بچھو بوائی، ۱۳۔ ستمگر، ۱۴۔ سویمبر، ۱۵۔ ریت کی گھڑی، ۱۶۔ بے وفا، ۱۷۔ تیسرا دیس، ۱۸۔ شور سلاسل، ۱۹۔ جونک، ۲۰۔ باکسنگ شو، ۲۱۔ گھن، ۲۲۔ چھینے ہوئے لمحے، ۲۳۔ قمیض، ۲۴۔ دستک سی درد دل پر۔ ان افسانوں میں رشتے، بے وفا، بچھو بوائی، ناگ پھنی کا کھیت اور دستک سی درد دل پر بے مثال افسانے جانے جاتے ہیں۔

افسانہ ''رشتے'' میں رفیعہ منظورالامین نے ہندوستانی سماج میں اقدار کے بحران کا نقشہ کھینچا ہے اور مغربیت کی طرف مائل ہونے والے معاشرے کی عکاسی کی ہے۔اس کے علاوہ افسانہ ''دستک سی درددل پر'' کشمیر کی رومانی فضا کے پس منظر میں لکھا گیا ہے اور حسین مناظر کی منظر کشی کرتے ہوئے انہوں نے انسان کی بے حسی اور خود غرضی کو ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے۔

رفیعہ منظورالامین کے افسانے عصر حاضر کی سماجی زندگی کے ترجمان ہیں۔انہیں زبان و بیان پر حد درجہ قدرت حاصل ہے۔سادہ سہل اور عام فہم زبان کا استعمال کرتے ہوئے اپنی بات کو بہت سلیقے سے رکھتی ہیں۔انہوں نے مختلف سماجی مسائل کو اپنے افسانے کا موضوع بنایا ہے اور منفی حقائق کی نشاندہی بھی کی ہے۔سماجی مسائل کو موضوع بناتے ہوئے انہوں نے قاری کو بھی غور وفکر کرنے کی دعوت دی ہے۔

غرض یہ کہ رفیعہ منظور الامین نے اپنی تخلیقی صلاحیتوں کے جوہر دکھا کر حیدرآباد کی خاتون قلمکاروں میں اپنی منفرد پہچان بنائی۔۳۰؍جون ۲۰۰۸ء کو ادب کی اس باصلاحیت فنکار نے داعی اجل کو لبیک کہا۔

پروفیسر سیدہ جعفر

پروفیسر سیدہ جعفر اردو زبان وادب کی معتبر و نامور محقق و ناقد تھیں۔انہوں نے اپنے تحقیقی وتنقیدی کارنامے کی بنیاد پر ہندوستان گیر شہرت حاصل کی۔ان کے بے شمار تحقیقی کارنامے منظر عام پر آچکے ہیں اور بالخصوص دکنیات کی تحقیق و تدوین کے متعدد کارنامے ان کی ادبی کاوشوں اور اردو ادب سے ان کی رقبت و محبت کے شاہد ہیں۔

پروفیسر سیدہ جعفر ایک صاحب علم خاندان سے تعلق رکھتی تھی۔ان کے دادا سید سجاد علی (تعلق دار) نواب مہدی نواز جنگ (سابق گورنر گجرات) کے بڑے بھائی تھے۔ان کے والد سید جعفر علی محکمہ آبکاری میں اعلیٰ عہدے پر فائز تھے اور سیدہ جعفر کے شوہر کا نام سید احمد مہدی تھا جو پیشے سے ایڈوکیٹ تھے۔ان کے جد اعلیٰ سید رضی نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خطبات کا مجموعہ ''نہج البلاغہ'' کے نام سے

مرتب کیا جو ان کا ایک یادگار کارنامہ تسلیم کیا جاتا ہے۔ سید محمد والہ موسوی بھی ان کے جد تھے جو ایک بلند پایہ مصنف وشاعر اور انشا پرداز کی حیثیت سے مشہور تھے۔ انہوں نے مثنوی ''پھولبن'' کے جواب میں مثنوی ''طالب موہنی'' کی تخلیق کی۔ اس مثنوی کو ڈاکٹر محی الدین قادری زور نے اپنے مقدمے کے ساتھ ۱۹۵۷ء میں مرتب کر کے شائع کیا۔

سیدہ جعفر ۱۹۳۴ء میں ضلع کریم نگر کے ایک علمی گھرانے میں پیدا ہوئیں۔ ابتدائی تعلیم کے مراحل کی تکمیل نامپلی گرلز ہائی اسکول، حیدرآباد میں ہوئی اور وہیں سے میٹرک کا امتحان کامیاب کیا۔ ویمنس کالج (عثمانیہ یونیورسٹی) سے انٹرمیڈیٹ میں کامیابی حاصل کرنے کے بعد عثمانیہ یونیورسٹی سے ہی بی۔اے اور ایم۔اے کی تعلیم بھی مکمل کی۔ اس کے بعد سیدہ جعفر نے پروفیسر عبدالقادر سروری کی زیر نگرانی ''اردو مضمون کا ارتقاء'' موضوع کے تحت مقالہ لکھ کر ۱۹۵۹ء میں پی۔ایچ۔ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ دوران تعلیم ہی ۱۹۵۸ء میں نظام کالج میں بحیثیت اردو لیکچرر ان کا تقرر ہو چکا تھا۔ ۱۹۶۵ء میں شعبہ اردو، جامعہ عثمانیہ یونیورسٹی میں ریڈر کے عہدے پر فائز ہوئیں۔ ۱۹۸۳ء میں پروفیسر اور ۱۹۸۴ء سے اور ۱۹۸۶ء تک بحیثیت صدر شعبہ اپنی خدمات کو انجام دیا۔ فروری ۱۹۹۱ء میں سیدہ جعفر بحیثیت پروفیسر اردو، حیدرآباد سنٹرل یونیورسٹی منتقل ہوئیں۔ وہاں انہیں ۱۹۹۴ء میں وظیفہ پر سبکدوش ہونے کے بعد مزید دو سال توسیع دی گئی اور بحسن خوبی انہوں نے اپنی خدمات کو انجام دیا۔

پروفیسر سیدہ جعفر کی کثیر تصانیف منظر عام پر آ چکی ہیں۔ انہوں نے ہمہ وقت اپنے آپ کو تخلیقی کاموں میں مصروف رکھا۔ ان کا طرز نگارش بصیرت افروز، سنجیدہ اور عالمانہ ہے۔ انہیں اردو اور انگریزی پر کافی عبور حاصل تھا۔ تاحال ان کی بتّیس (۳۲) کتابیں شائع ہو کر علمی و ادبی دنیا میں مقبول ہو چکی ہیں اور ان میں بعض کتابوں کے ترجمے بھی مختلف زبانوں میں ہو چکے ہیں۔ انہوں نے خود کو صرف قدیم ادب یا دکنیات تک محدود نہیں رکھا ہے بلکہ انہیں جدید ادب پر بھی قدرت حاصل تھی۔ انہوں نے ادبی دنیا میں ہونے والی تبدیلیوں کا بغور مطالعہ کیا ہے۔ ادبی تحقیق و جستجو کے سلسلے میں انہیں پاکستان، ایران اور لندن جیسے ممالک کا سفر کرنا پڑا اور ان ملکوں سے انہوں نے استفادہ حاصل کیا۔

سیدہ جعفر کی پہلی کتاب ''ماسٹر رام چندر اور اردو نثر کے ارتقاء میں ان کا حصہ'' تھی۔ چند اہم تحقیقی وتنقیدی کتابیں قابل ذکر ہیں: من سمجھاون، فن کی جانچ، دکنی رباعیاں، سکھ انجن، تنقید اور انداز نظر، مہک اور محک، دکنی نثر کا انتخاب، مثنوی یوسف زلیخا، چندر بدن ومہیار، کلیات محمد قلی قطب شاہ، مثنوی ماہ پیکر، جنت سنگار، دکنی ادب میں قصیدے کی روایت، اردو ادب کی تاریخ ۱۷۰۰ء تک بہ اشتراک گیان چند جین، اردو ادب کی تاریخ ۱۷۰۰ء سے ترقی پسند تحریک تک، گلدستہ اور نوسرہار کے علاوہ دکنی لغت بھی لکھا۔

ڈاکٹر سیدہ جعفر کی پہلی کتاب ''ماسٹر رام چندر اور اردو نثر کے ارتقاء میں ان کا حصہ'' ۱۹۶۰ء میں، مولانا ابوالکلام آزاد اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ سے شائع ہوئی۔ یہ کتاب دو حصوں میں منقسم ہے۔ کتاب کے پہلے حصے میں ماسٹر رام چندر کے حالات زندگی اور ان کی تصانیف کا جائزہ پیش کیا گیا ہے اور دوسرے حصے میں ماسٹر رام چندر کے مضامین کو منتخب کر کے بہ اعتبار موضوع ترتیب دیا گیا ہے۔ سیدہ جعفر نے ڈاکٹر زور کی خواہش پر شاہ تراب چشتی کی منظوم تصنیف ''من سمجھاون'' پر کام کیا۔ یہ مثنوی مہاراشٹرا کے عظیم فلسفی اور مشہور شاعر سمرتھ رام داس کی تصنیف ''شری مناچے شلوک'' سے متاثر ہو کر لکھی گئی تھی۔ دکنیات میں سیدہ جعفر کی یہ پہلی تحقیقی تصنیف تھی۔ ان کی کتاب ''دکنی رباعیاں'' ۱۹۶۶ء میں منظر عام پر آئی یہ ان کا ایک اہم تحقیقی کارنامہ ہے۔ دو حصوں پر مشتمل اس کتاب کے پہلے حصے میں رباعی کے فن پر بحث کی گئی ہے جبکہ دوسرے حصے میں چھتّیس (۳۶) شعراء کی رباعیاں معہ تدوین متن دی گئی ہیں۔ ''سکھ انجن'' شاہ ابوالحسن کی ایک تمثیلی نظم ہے جس میں تصوف کے مسائل اور نکات کو ''آنکھ مچانی'' کے کھیل کی تمثیل میں پیش کیا ہے۔ ''سکھ انجن'' کو پروفیسر سیدہ جعفر نے ۱۹۶۸ء میں مرتب کر کے لطف الدولہ اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ سے شائع کیا۔ اس کتاب میں سیدہ جعفر نے شاہ ابوالحسن کے حالات زندگی اور ادبی خدمات پر مفصل روشنی ڈالتے ہوئے ان کے کلام کا تنقیدی جائزہ پیش کیا ہے۔ ''کلیات محمد قلی قطب شاہ'' میں سیدہ جعفر نے محمد قلی کی بارہ غزلوں کو اردو دنیا سے متعارف کروایا۔ یہ غزلیں انہوں نے لندن میں وہاں کے ایک نوادرات کے تاجر سے حاصل کی تھی۔ انہوں نے دکنی تحقیق کے علاوہ تنقید، ترجمہ، لغت نویسی اور ادبی تاریخ میں بھی اپنی ادبی صلاحیتوں پر دسترس ہونے کا پختہ ثبوت پیش کیا۔ ترجمے میں ہردیا کماری کی تصنیف ''ویلا

تھال‘‘ کا اردو ترجمہ ان کا ایک کامیاب کارنامہ ہے۔ جو ساہتیہ اکیڈمی کی جانب سے ۱۹۹۰ء میں شائع کیا گیا۔ ان کی تنقیدی کتابیں ’’تنقید اور انداز نظر‘‘، ’’مہک اور محک‘‘ اور ’’فن کی جانچ‘‘ اردو ادب کے سرمائے میں قابل قدر حیثیت رکھتی ہیں۔ ’’تاریخ ادب اردو ۱۷۰۰ء تک‘‘ قومی کونسل کی جانب سے سیدہ جعفر نے گیان چند جین کے اشتراک سے پانچ جلدوں میں لکھی۔ اس کے علاوہ ’’تاریخ ادب اردو (عہد میر سے ترقی پسند تحریک تک)‘‘ چار جلدوں میں لکھی جو ۲۰۰۲ء میں منظر عام پر آئی۔ پروفیسر سیدہ جعفر کی ان تصانیف کے علاوہ سینکڑوں پر مغز نثر پارے اور مضامین جرائد اور اخبارات میں شائع ہو چکے ہیں۔

پروفیسر سیدہ جعفر مختلف علمی و ادبی اداروں سے بھی وابستہ رہیں۔ علمی و ادبی خدمات پر انہیں کئی اعزازات و انعامات سے نوازا گیا۔ ان اعزازات میں ڈاکٹر زور ایوارڈ، فراق گورکھپوری ایوارڈ، نوائے میر ایوارڈ، مخدوم ادبی ایوارڈ، بسٹ اردو اسکالر ایوارڈ، قاضی عبدالودود ایوارڈ برائے تحقیق، ساہتیہ اکیڈمی ایوارڈ اور عالمی فروغ اردو ادب ایوارڈ برائے ۲۰۰۹ء شامل ہیں۔ پروفیسر سیدہ جعفر کی وفات ۲۴ر جون ۲۰۱۶ء کو ہوئی۔

پروفیسر ثمینہ شوکت

پروفیسر ثمینہ شوکت اردو دنیا کی ایک نامور شخصیت مانی جاتی ہیں۔ انہوں نے علمی و ادبی میدانوں میں متعدد کارنامے انجام دیے ہیں۔ قدیم ادب کی تحقیق میں ان کے کارناموں کو قابل قدر مقام حاصل ہے۔ انہوں نے ادب کے بے شمار قدیم اعلی نمونوں کو منظر عام پر لا کر نہ صرف اردو تحقیق کی تاریخ کو ادبی خزانے سے مالا مال کیا بلکہ محققین کی فہرست میں اپنا ایک ممتاز مقام حاصل کیا۔ ان کا شمار اردو ادب کی ایک باصلاحیت اور فعال استاد کی حیثیت سے بھی ہوتا ہے۔ ان کی ادبی خدمات کے سلسلے میں انہیں یو۔ جی۔ سی کی طرف سے دو سال کے لیے بطور اعزاز فیلوشپ بھی جاری کی گئی۔ جامعاتی سطح پر یہ اعزاز پانے والی وہ پہلی خاتون پروفیسر تھیں۔

پروفیسر ثمینہ شوکت کا آبائی وطن گلبرگہ ہے۔ ان کی ولادت ۱۹۳۶ء میں گلبرگہ میں ہوئی۔ ان کا

تعلق گلبر گہ کے ایک علمی، ادبی اور مذہبی خانوادے سے تھا۔ان کے والدسید منہاج الدین ایک متقی اور ادب شناس شخص تھے۔ثمینہ شوکت کے دادا حضرت چندا حسینی ایک بزرگ تھے جن کی مزار گوگی شریف میں ہے اور انکے نانا محمد عبدالقادر صدیقی اور پڑنانا محمد معصوم صدیقی بھی علم وادب سے ذوق وشوق رکھتے تھے۔

پروفیسر ثمینہ شوکت کی ابتدائی تعلیمی مراحل کی تکمیل گلبر گہ میں ہوئی۔۱۹۵۰ء میں گلبر گہ سے ہی میٹرک کا امتحان کامیاب کیا اوراس کے بعد حیدرآباد کی طرف رخ کیا۔عثمانیہ یونیورسٹی سے۱۹۵۴ء میں بی۔اے اور ۱۹۵۶ء میں ایم۔اے پاس کیا۔اس کے بعد ۱۹۵۹ء میں پروفیسر عبدالقادر سروری کی نگرانی میں تحقیقی موضوع ''مہاراجہ چندولعل شاداں حیات اور کارنامے'' پر مقالہ تحریر کر پی۔ایچ۔ڈی کی ڈگری حاصل کی۔

ایم اے کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد ہی ڈاکٹر ثمینہ شوکت کا تقرر نظام کالج میں بحیثیت لکچر رہو چکا تھا۔اس کے فوراً بعد ہی ان کا تبادلہ ویمنس کالج میں ہوا اور وہاں پر انہوں نے ۱۹۷۹ء تک اپنی خدمات کو انجام دیا۔حیدرآباد یونیورسٹی کے قیام کے بعد ان کا تقرر اس یونیورسٹی میں بحیثیت ریڈر ہوا اس کے بعد وہیں پر بطور پروفیسر اور صدر شعبہ اردو خدمت کرتی رہیں۔۱۹۹۴ء میں وظیفہ پر سبکدوش ہوئیں۔ان کا انتقال ۱۰/مارچ ۲۰۱۷ء کو ہوا۔

پروفیسر ثمینہ شوکت کو بچپن سے ہی ادب میں دلچسپی رہی۔ ربندر ناتھ ٹیگور کی گیتا نجلی، حفیظ جالندھری کی شاہنامہ اسلام اور علامہ اقبال کی نظم شکوہ اور جواب شکوہ نے ان کو کافی متاثر کیا۔خصوصی طور پر علامہ اقبال سے بہت کم عمری سے ہی متاثر تھیں۔اسی کم عمری کے دور میں ہیں انہوں نے ایک مضمون ''گل بزمردہ'' کے عنوان سے لکھا جو روز نامہ منزل، حیدرآباد میں شائع ہوا اور چند نظمیں بھی لکھیں جو رسالہ آواز، حیدرآباد میں شائع ہوئیں۔گزرتے وقت کے ساتھ جوں جوں ان کی ذہنی نشو ونما کو فروغ ملتا گیا اور شعور میں پختگی آتی گئی انہوں نے تحقیق وتنقید کی راہ اختیار کی اور اپنی تحریروں کے ذریعہ اپنی صلاحیتوں کا بہترین ثبوت پیش کیا۔ان کے ادبی کارنامے ان کی ادبی صلاحیت اور تحقیقی وتنقیدی شعور کی شاہد ہیں۔ پروفیسر ثمینہ شوکت کی مرتبہ اور تصنیف کی ہوئی کتابیں جو منظر عام پر آچکی ہیں یوں ہیں:

۱۔شکارنامہ، ۲۔حیات لطف، ۳۔کلیات لطف، ۴۔دیوان لطف، ۵۔مثنوی لطف، ۶۔مہ لقا، ۷۔مہاراجہ چندولعل شاداں اور حیدرآباد کا سیاسی و سماجی پس منظر، ۸۔مہاراجہ چندولعل شاداں حیات اور کارنامے، ۹۔خدنگ جستہ (تحقیق وتنقیدی مضامین کا مجموعہ)، ۱۰۔اردو کی ترسیلی لسانیات پیکر و پیکار (بہ اشتراک سکندر توفیق)، اور ۱۱۔بارہ ماسہ بایکٹ کہانی رافضل۔ اسکے علاوہ دیوان لطف اور کلیات لطف بھی اہمیت کی حامل تصانیف ہیں۔

ڈاکٹر ثمینہ شوکت کی ان تصانیف کا ذکر کرتے ڈاکٹر آمنہ تحسین لکھتی ہیں:

''دیوان لطف اور کلیات لطف کافی تلاش کے بعد بھی دستیاب نہ ہوسکے حتیٰ کہ ان کا ذکر بھی کسی لائبریری کی فہرستوں میں نہیں ہے جبکہ پروفیسر ثمینہ شوکت صاحبہ کا استدلال ہے کہ مثنوی لطف، دیوان لطف اور کلیات لطف بالکلیہ میری دریافت ہیں۔''[۱]

ڈاکٹر ثمینہ شوکت کے تحقیقی کارناموں میں ''مہ لقا'' ان کی ابتدائی تحقیقی کاوش ہے۔اس سے قبل مہ لقا کو ایک طوائف کے روپ میں تسلیم کیا جاتا تھا لیکن ثمینہ شوکت نے اپنی تحقیق کے ذریعہ مہ لقا کو ایک اچھی شاعرہ کا مقام دلایا۔اس سے پہلے بھی مہ لقا پر کتابیں لکھی گئیں تھیں لیکن وہ مستند ثابت نہ ہوئیں اس لئے ثمینہ شوکت نے مہ لقا کی شخصیت کو اس زمانے کے پس منظر میں پیش کرنے کی کوشش کی اور انہیں کامیابی بھی حاصل ہوئی۔ ''مہاراجہ چندولعل شاداں حیات اور شاعری'' بھی ثمینہ شوکت کا ایک اہم تحقیقی کارنامہ ہے۔اس موضوع پر انہوں نے اپنا تحقیقی مقالہ پی۔ایچ۔ڈی کے لئے مکمل کیا تھا۔اس مقالہ کی اشاعت دوحصوں میں ہوئی۔ پہلا حصہ ۱۹۷۹ء میں ''مہاراجہ چندولعل شاداں اور حیدرآباد کا سیاسی وسماجی پس منظر'' اور دوسرا حصہ ۱۹۸۴ء میں ''مہاراجہ چندولعل شاداں حیات اور شاعری'' کے عنوان سے شائع ہوا۔

ثمینہ شوکت نے متن کی ترتیب وتدوین میں بھی طبع آزمائی کی۔حضرت خواجہ بندہ نواز گیسودراز کی تصنیف ''شکارنامہ'' کو انہوں نے ۱۹۶۲ء میں شائع کیا تھا۔اس رسالہ کو مختلف نسخوں کے متن سے تقابل

[۱] ڈاکٹر آمنہ تحسین، حیدرآباد میں اردو ادب کی تحقیق، ایجوکیشنل ہاؤس پبلشنگ، دہلی، ۲۰۱۰ء، ص ۳۳۷-۳۳۸

کرنے کے بعد انہوں نے ترتیب کے عمل کو انجام دیا ہے چونکہ یہ مختصر رسالہ تھا اور اس پر ثمینہ شوکت نے بہترین مقدمہ لکھا ہے جس میں انہوں نے شکارنامہ کے ساتھ ساتھ دوسرے قدیم رسالوں کا بھی جائزہ لیتے ہوئے صوفی، سنتوں کے متعلق معلومات اکٹھا کی ہیں۔

پروفیسر ثمینہ شوکت نے مثنوی ''نیرنگ عشق'' جو لطف نے لکھی ہے ۱۹۶۲ء میں ''ادان تحقیقات اردو'' سے شائع کیا۔اس مثنوی کے ان کو تین نسخے برآمد ہو سکے، جس کا تقابل کرتے ہوئے متن کو ترتیب دیا گیا اور لوگوں کو ''مصنف اور کارنامہ'' عنوان کے تحت لطف اور ان کی شاعری سے روشناس کرایا۔ پروفیسر ثمینہ شوکت کی تصانیف ''خدنگ جستہ (تحقیقی وتنقیدی مضامین کا مجموعہ)'' اور ''اردو کی ترسیلی لسانیات'' اردو ادب کی اہم اور نمائندہ تصانیف ہیں۔

پروفیسر ثمینہ شوکت کو ان کے تحقیقی وتنقیدی کارنامے پر اتر پردیش اردو اکیڈمی، مغربی بنگال اردو اکیڈمی، بہار اردو اکیڈمی اور آندھرا پردیش اردو اکیڈمی نے انعامات واعزازات سے نوازا۔اس کے علاوہ لکھنؤ میر ایوارڈ جیسے باوقار اعزاز سے بھی سرفراز کیا گیا اور ۱۹۸۵ء میں یو۔جی۔سی کی جانب سے انہیں نیشنل فیلو ایوارڈ بھی حاصل کیا تھا۔

نجمہ نکہت

اردو ادب میں دکن کی سرزمین پر نجمہ نکہت کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے۔ان کا اصل نام نجمہ سراج الحسن اور قلمی نام نجمہ نکہت ہے۔۲۴ رمئی ۱۹۳۶ء کو حیدرآباد میں پیدا ہوئیں۔ان کے آباواجداد یو پی کے شہر لکھنؤ کے متوطن تھے۔ان کے والد کا نام سید سراج الحسن تھا جو پیشہ سے وکیل تھے اور ان کے بھائی حامد حسن ادارہ میسکو کے ڈائریکٹر رہ چکے ہیں۔

نجمہ نکہت کی ابتدائی تعلیم حیدرآباد میں ہوئی۔۱۹۵۳ء میں جبکہ ان کی عمر صرف سترہ برس تھی وہ ازدواجی زندگی کے بندھن میں بندھ گئیں۔ان کی شادی لکھنؤ کے ایک تعلیم یافتہ خاندان میں ہوئی ان کے شوہر کا نام شیخ احمد حسین قدوائی تھا۔وہ ملازمت کی غرض سے حیدرآباد میں مقیم تھے۔

نجمہ نکہت بچپن سے ادبی ذوق وشوق رکھتی تھیں اوران کی توجہ افسانہ نگاری میں تھی۔صرف گیارہ سال کی عمر میں انہوں نے ایک افسانہ ''وہ راتیں'' لکھا جو رسالہ ''جادہ'' بھوپال میں شائع ہوا۔۱۹۵۰ء سے باقائدہ طور پر لکھنے کی ابتدا کی۔ جب ۱۹۵۳ء میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی تنظیم جدید، انجمن عوامی مصنفین کے نام سے اپنے کام کوانجام دینے لگی تو انہوں نے مجلس عاملہ کے رکن کی حیثیت سے اس تنظیم میں کام کیا۔ ہر ہفتہ اس انجمن کی میٹنگ کا انعقاد عمل میں لایا جاتا جس میں ادبی ہنگامے اور مشاعرہ ہوا کرتے تھے اور شہر حیدرآباد کے تمام ادیب وشعراء پابندی کے ساتھ اس انجمن کی سرگرمیوں میں شرکت کرتے تھے۔

نجمہ نکہت نے متعدد افسانے لکھے اوران کے کچھ افسانوں کا مختلف زبانوں میں ترجمہ بھی کیا جا چکا ہے۔ چنانچہ پرکاش پنڈت نے اردو کی خواتین افسانہ نگاروں کے بہترین افسانوں کا انتخاب کر کے ہندی میں ''پھول کھلتے ہیں'' کے نام سے شائع کیا۔اس میں نجمہ نکہت کا افسانہ ''دو ٹکے کی'' بھی شامل ہے۔

۱۹۶۶ء کو جب نجمہ نکہت کے شوہر قدوائی صاحب کا اچانک حرکت قلب بند ہونے سے انتقال ہو گیا اور وہ اس صدمے کو برداشت نہ کرسکیں اور کچھ عرصے کے لئے اپنی یادداشت کھو بیٹھیں۔ جب دوبارہ ان کی یادداشت بحال ہوئی تو انہوں نے ہمت کو پست نہیں کیا بلکہ پختہ عزم کے ساتھ تعلیم کے ٹوٹے ہوئے سلسلے کو جاری کیا اور اپنی بیٹیوں کی بہتر پرورش بھی کی۔ گریجویشن کی تعلیم کو مکمل کرنے کے بعد انہوں نے دوبارہ اپنے ذہن کو افسانہ نویسی کی جانب راغب کیا۔

نجمہ نکہت نہ صرف ترقی پسند مصنفین کی رکن رہیں بلکہ وہ حلف کی تنظیم ''حیدرآباد لٹریری فورم'' سے بھی وابستہ رہیں۔اس کے علاوہ وہ اردو اکیڈمی آندھرا پردیش کے بورڈ آف گورنرس کی ممبر بھی رہ چکی ہیں۔ ان کے افسانے آل انڈیا ریڈیو حیدرآباد اور آل انڈیا ریڈیو دہلی سے اکثر وبیشتر نشر ہوتے تھے۔''سیب کا درخت'' نجمہ نکہت کا پہلا افسانوی مجموعہ ہے۔ اس کے علاوہ ایک اور مجموعہ ''کسانوں کی دھرتی'' ہے۔ مجموعہ ''سیب کا درخت'' میں درج ذیل پندرہ افسانوں کوشامل کیا گیا ہے۔

۱۔کھنڈر ۲۔سائے، ۳۔پتھر اور کونپل، ۴۔دو ٹکے کی، ۵۔اس رہگزر پر، ۶۔آخری حویلی، ۷۔ایئر کنڈیشنڈ، ۸۔ پھر وہی صبح پھر وہی شام، ۹۔سیب کا درخت، ۱۰۔شبنم اور انگارے، ۱۱۔وہ دونوں،

۱۲۔سیکنڈ ہینڈ،۱۳۔دھندلے نقوش،۱۴۔ریشمی قمیض اور ۱۵۔دور دیش سے۔

نجمہ نکہت کے افسانوں میں تجربات و مشاہدات کی گہری جھلک نظر آتی ہے۔انہوں نے خیالی کردار سے کنارہ کشی کرتے ہوئے زندگی کے حقیقی کردار کو سامنے لانے کی کوشش کی ہے۔وہ ہر واقعہ یا کردار کو بہت گہرائی کے ساتھ مشاہدہ کرنے کے بعد ہی اپنی قلم کے ذریعے اس کی عکاسی کرتیں ہیں۔ روزمرہ کے واقعات ان کے افسانے کا ایک خاص فن ہیں جس کی بدولت وہ اپنے کرب کو ہلکا کرتی ہیں۔ نظام کے دور کی شان بان اور اس کا عکس بھی ان کے افسانوں میں موجود ہے اور بادشاہی دور کا زوال بھی نظر آتا ہے۔کھنڈر، آخری حویلی، دو ٹکے کی، سیب کا درخت، افسانے اسی جاگیردارانہ نظام کے دور سے متاثر ہو کر لکھے گئے جب کہ ''سائے'' کا پس منظر مختلف ہے۔ یہ اس دور کے خاتمے کے بعد ایک نئے دور کی ترجمانی کرتا ہے۔نئی نسل کی جدوجہد، طوفان سے ابھرنے کی کیفیت اور رئیسوں کی پرانی ذہنیت کے منفی پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے۔انہوں نے اپنی تہذیب کلچر، روایات، ماحول کی صحیح عکاسی کے ساتھ ساتھ زندگی کے متعلق ایک واضح نقطہ نظر کو پیش کیا ہے اور نئی نسل کی ذہنی تربیت کرنے کی کوشش کی ہے۔

نجمہ نکہت نے ترقی پسند دور میں کافی افسانے لکھے اور ان کا شمار اس دور کے ممتاز افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔

جیلانی بانو

جیلانی بانو اردو کی ہمہ جہت ادیبہ ہیں۔انہوں نے نثر کی تقریباً تمام اصناف پر طبع آزمائی کی ہے اس کے علاوہ انہوں نے کتابوں پر تبصرے بھی کیے۔ ناول اور افسانہ نگار کی حیثیت سے وہ ملک و بیرون ملک کی مشہور شخصیت ہیں۔

جیلانی بانو کی پیدائش ۱۴ر جولائی ۱۹۳۶ء کو بدایوں (اتر پردیش) میں ہوئی۔ان کا تعلق بدایوں کے علمی و ادبی گھرانے سے ہے۔ان کے والد حیرت بدایونی عربی و فارسی کے جید عالم ہونے کے ساتھ ساتھ ایک ممتاز و خوش فکر شاعر بھی تھے۔اس وقت کے بڑے مصنفین مثلاً سجاد ظہیر، مخدوم محی الدین، جگر

مراد آبادی، کرشن چندر اور مجروح سلطانپوری وغیرہ سے انکے والد کے اچھے مراسم تھے۔حیرت بدایونی ملازمت کی غرض سے حیدر آباد آئے اور یہیں سکونت اختیار کر لی۔

جیلانی بانو نے ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد ۱۹۵۹ء میں عثمانیہ یونیورسٹی سے بی۔اے کی ڈگری حاصل کی۔اسی سال یہ ازدواجی زندگی میں داخل ہوگئیں اوران کی شادی ڈاکٹر معظّم کے ساتھ ہوئی جو عثمانیہ یونیورسٹی میں اسلامک اسٹڈیز کے صدر شعبہ کے فرائض انجام دے چکے ہیں۔ جیلانی بانو نے ایم۔اے کا امتحان دہلی یونیورسٹی سے امتیازی نشانات سے کامیاب کیا۔

جیلانی بانو کی پرورش خالص ادبی ماحول میں ہوئی اوراس ادبی ماحول نے ان کی تربیت اور شخصیت کی نشو ونما میں اہم کردار ادا کیا۔بچپن سے ہی وہ سعادت حسن منٹو،عصمت چغتائی، میر تقی میر، غالب،اقبال، گورکی، چیخوف، بیدی،فیض احمد فیض،مجاز،قرۃ العین حیدراوراحمد ندیم کی تصانیف سے متاثر تھیں۔ان ادباء کی تخلیقات نے ان کی ذہنی صلاحیتوں کوعروج بخشا۔گھر کے شاعرانہ ماحول میں جیلانی بانو کی ذہنی تربیت کی۔انہوں نے فکشن نگاری کواپنایا اوراس فن کوایک معتبر مقام تک پہنچا دیا۔انہوں نے اپنی تخلیقات میں ایک منفرد طرز تحریر کواپنایا۔

جیلانی بانو کے افسانوی ادب کا دور ۱۹۴۸ء سے شروع ہوتا ہے۔ان کا پہلا افسانہ ’’ایک نظر ادھر بھی‘‘ جو ۱۹۵۲ء میں ادب لطیف، لاہور کے خاص نمبر میں شائع ہوا تھا۔اس کے بعد انہوں نے ’’موم کی مریم‘‘ تحریر کیا جو ماہنامہ ’’سویرا‘‘ میں شائع ہوا۔اس شہرہ آفاق تحریر نے جیلانی بانو کوشہرت کی بلندیوں پر پہنچا دیا۔جس دور میں ان کی افسانہ نگاری کا آغاز ہوا وہ دور ترقی پسند تحریک کے عروج کا دور تھا۔ جیلانی بانو بھی ذہنی طور پر ضرور اس تحریک کی حامی تھیں لیکن عملی طور پر انہوں نے کبھی بھی اپنے آپ کو کسی بھی تحریک یا پارٹی سے وابستہ نہیں کیا۔ جیلانی بانو کے افسانے ہندو پاک کے نامور جرائد جیسے ادب لطیف، افکار، سویرا، صبا، ایوان، بیسویں صدی، بانو، شمع،شاعر، اظہار، تخلیقی ادب،عصری ادب،عصری آگہی،آج کل، اوراق،نقوش،شعر وحکمت فنون،تہذیب، وغیرہ میں شائع ہوتے رہے۔

جیلانی بانو نے ایک ادبی ماہنامہ ’’چراغ‘‘ میں بحیثیت ادارت کے فرائض انجام دیا ہے۔انہوں

نے نثر کی تمام اصناف پرطبع آزمائی کی ہے۔ ناول اور افسانوں کے علاوہ تنقیدی مضامین میں بھی اپنی صلاحیتوں کے جوہر دکھائے ہیں۔ان کی حسب ذیل گیارہ کتابیں منظر عام پر آ کر ادبی دنیا میں مشہور و مقبول ہوچکی ہیں جنمیں ناول،افسانے،تراجم اور تحقیقی تصانیف سبھی ہیں:

روشنی کے مینار (۱۹۵۸)،نروان (۱۹۶۳)، پرایا گھر (افسانے)،ایوان غزل (۱۹۷۷)، بارش سنگ (۱۹۸۵) ناول، جگنواور ستارے (۱۹۶۵)، نغمے کا سفر (۱۹۷۷) ناولٹ،جیتی جاگتی کہانیاں (بچوں کے لیے)، کرشن چندفن اور شخصیت (مقالہ)، ملیالم کہانیوں کا ہندی سے اردو میں ترجمہ، قصہ روز کا (افسانے)۔

جیلانی بانو کے افسانوں کا پہلا مجموعہ ''روشنی کے مینار'' اور پہلا ناول ''ایوان غزل'' تھا ان کی کہانیوں میں حیدر آباد کی تہذیب و ثقافت کی جھلک واضح طور پر نظر آتی ہے۔ان کے ناولوں میں کمسن لڑکی، نوجوان خاتون، بیوی، ساس اور خاتون کا ہر کردار ہے جو کسی نہ کسی طرح انسانی رشتوں سے منسلک ہوتا ہے۔ان کے ناولوں کی خواتین کا کردار گھریلو زندگی، خاندانی سازشوں،سماجی عدم مساوات کا شکار نظر آتا ہے جو فرسودہ معاشرے اور مطلب پرست گھریلو خاندانی نظام کے آئینہ دار ہیں۔غریب وسماج کے پسماندہ طبقے کوانھوں نے اپنی کہانیوں کا موضوع بنایا ہے اور ساتھ ہی ساتھ اپنے ناولوں میں سماجی و سیاسی سطح پر ہونے والے گھریلو تشدد کو بڑے بے باکانہ انداز میں پیش کیا ہے۔

جیلانی بانو کو ان کے ادبی کارناموں پر مختلف اداروں اور انجمنوں نے مختلف اعزازات سے سرفراز کیا گیا ہے۔ان کی تقریباً تمام کتابوں پر اردو اکیڈمی آندھرا پردیش کے علاوہ مغربی بنگال، بہار اور اتر پردیش اردو اکیڈمی کی جانب سے ایوارڈ مل چکے ہیں۔اس کے علاوہ وہ ۱۹۷۹ء میں غالب ایوارڈ اور ۱۹۸۵ء میں ان کی ادبی خدمات کے اعتراف میں سوویت لینڈ نہرو ایوارڈ اور توصیفی سند سے نوازا گیا ہے۔ حکومت ہند کی جانب سے ''پدم شری ایوارڈ'' اور پاکستان کی جانب سے ''نقوش'' ایوارڈ بھی عطا کیا گیا ہے۔

عفت موہانی

عفت موہانی کا شمار حیدرآباد کی نامور قلمکاروں میں کیا جاتا ہے۔عفت موہانی کا اصل نام خورشید سلطانہ ہے اورعفت موہانی قلمی نام ہے۔

عفت موہانی ۲۴؍جولائی ۱۹۳۷ءکوحیدرآباد میں پیدا ہوئیں۔ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد عثمانیہ یونیورسٹی سے بی۔اے(آنرز)اورایم۔اے و بی۔ایڈ امتیازی حیثیت سے کامیاب کیا۔بچپن سے ان کا ذہن تصنیف وتالیف کی طرف مائل تھا۔ابھی صرف آٹھ برس کی ہی تھیں کی کہانیاں لکھنا شروع کر دیا۔ان کی کہانیاں ’’میزان‘‘ اخبار کے بچوں کے صفحے پر متعدد مرتبہ شائع ہوئیں۔ان کے منہ بولے بڑے بھائی ابن صفی مرحوم اور کرنل شفیق الرحمان کی تحریروں نے ان کو کافی متاثر کیا۔ ان کا پہلا افسانہ ’’مذاق‘‘ ۱۹۶۰ء میں رسالہ ’’بیسویں صدی‘‘ میں شائع ہوا۔اسکے بعد انہوں نے متعدد افسانے لکھے جو مختلف رسائل جیسے ساقی، جام نو، الشجاع، زیب النساء، بتول، اوراق، سیپ، امید، پونم، بیسویں صدی، روبی، حریم، تحریک، جلتے دیپ، اشعار، شب خون، شاعر، زیور، صبح نو فلمی ستارے، فلمی تصویر، وغیرہ میں شائع ہوتے رہے۔ ہندوپاک کا کوئی ایسا رسالہ باقی نہیں جس میں ان کے افسانے شائع نہ ہوئے ہوں۔عفت موہانی نے ناول بھی لکھے ہیں ان کا سب سے پہلا ناول ’’ستم کے سہارے‘‘ ہے۔جوانہوں نے نسیم انہونوی صاحب کی تحریک پر لکھا اوراس ناول کو بے حد مقبولیت بھی حاصل ہوئی۔ان کے چند ناول یوں ہیں:

ستم کے سہارے، اک چراغ دور کا، بزدل، مہمان، آہوں کے گیت، پھول کال تقدیر، زورِ پشیماں، سچے بندھن، سویرے، سزا، شام تمنا، شرارت، درد کا رشتہ، داغ دل، محبت نام ہے غم کا، محبت کی راہیں، ہمسفر، صداور، ہم تو جیے بس تیرے لیے، دارو درماں، صنم، صبا، وفا کا دکھ، پرائی آگ، خواب و سراب، نغمہ سنگ، دوراہا، پیاسی برسات، وغیرہ۔

عفت موہانی نے اپنے ادبی سفر کا آغاز افسانہ نگاری سے کیا تھا۔ان کے چند افسانوں کے نام اس طرح ہیں:

خون بہا شکست پیا کا، بیٹی، پیاسا، رشتہ دل کا، اندیشوں کا سایہ، حصار، ذرا سی بات، پیاس اور سراب، دھیمے دھیمے چراغ جلتے ہیں، امیر وغریب، ایک پھول چار کانٹے، مذاق، شام، انجام، بگولے، بے وفا، روح کے چھالے، وغیرہ۔

عفت موہانی نے ہر قسم کے افسانے لکھے ہیں ان کے افسانوں میں رومانیت بھی ہے اور سیاست بھی اور سماجی مسائل کو بھی پیش کیا ہے۔ وہ اپنے افسانوں میں اخلاقی اقدار کو بہت اہمیت دیتی ہیں۔ ان کے افسانوں میں موجود یہ تمام عناصر ان کی وسیع النظری، غور وفکر اور وسیع مطالعہ کا نتیجہ ہے۔ عفت موہانی کے افسانے ہر نقطہ نظر سے بہتر اور سبق آموز ہوتے ہیں۔ افسانہ کے مقابلے ناول نگاری کی طرف ان کی طبیعت زیادہ مائل رہی۔ غرض انہوں نے اپنی افسانہ نگاری اور ناول نگاری کی بدولت حیدرآبادی قلمکاروں میں اپنا ایک منفرد مقام بنایا ہے۔

پروفیسر اشرف رفیع

پروفیسر اشرف رفیع (اشرف النساء بیگم) حیدرآباد کی ایک مشہور ومقبول شاعرہ ہیں۔ وہ محقق اور نقاد کی حیثیت سے بھی جانی جاتی ہیں شاید اسی لیے انہوں نے اپنے آپ کو بحیثیت ایک شاعرہ منوانے کی کوشش نہیں کی۔ وہ مشاعروں سے دوری بنائے رکھتی ہیں اور رسالوں میں بھی اپنے کلام کو بہت کم ہی چھپواتی ہیں۔ وہ صرف مخصوص محفلوں میں ہی اپنے کلام کو پیش کرتی ہیں۔ قومی سطح پر وہ ایک اچھی شاعرہ کی شناخت رکھتی ہیں تاہم تحقیقی میدان میں انہیں زیادہ شہرت حاصل ہے۔

پروفیسر اشرف رفیع یکم رجنوری ۱۹۳۸ء کو حیدرآباد میں پیدا ہوئیں۔ ابتدائی تعلیم سٹی ہائی اسکول سے حاصل کی اور وہیں سے ۱۹۵۵ء میں میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ ویمنس کالج، حیدرآباد سے ۱۹۵۷ء میں انٹرمیڈیٹ کا امتحان کامیاب کیا۔ ۱۹۶۱ء میں بی۔اے کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد جامعہ عثمانیہ میں ایم۔اے (سوشیالوجی) میں داخلہ لیا لیکن کچھ ہی دنوں بعد اس مضمون کو ترک کر کے ایم۔اے اردو کی طرف رجوع کیا۔ ۱۹۶۵ء میں ایم۔اے (اردو) کامیاب کیا۔ ایم۔اے کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد

پی۔ایچ۔ڈی میں داخلہ لیا اور ۱۹۶۹ء میں انہوں نے ''نظم طباطبائی کی حیات اور علمی و ادبی کارناموں کا تنقیدی جائزہ'' کے موضوع پر مقالہ داخل کیا اور اس مقالے پر انہیں اور ۱۹۷۱ء میں پی۔ایچ۔ڈی کی سند حاصل ہوئی۔اشرف رفیع صاحبہ شعبہ اردو کی پہلی طالبہ تھی جنہیں یو۔جی۔سی کی جانب سے اسکالرشپ دی گئی تھی۔

پروفیسر اشرف رفیع نے ۱۹۷۰ء میں عملی زندگی میں قدم رکھا۔پہلی مرتبہ ان کا تقرر ونیتا مہاودیالہ کالج میں بحیثیت اردو لکچرر ہوا اور وہیں پر انہوں نے ۱۹۷۷ء تک اپنی خدمات کو انجام دیا۔اس کے بعد نومبر ۱۹۷۷ء میں شعبہ اردو، جامعہ عثمانیہ سے وابستہ ہوئیں۔۱۹۸۹ء میں پروفیسر کے عہدے پر فائض ہوئیں اور دو مرتبہ صدر شعبہ کے فرائض بھی انجام دیئے۔دسمبر ۱۹۹۷ء میں درس و تدریس کی ذمّہ داریوں سے سبکدوش ہوئیں۔لیکن اس کے بعد بھی علم و ادب کی ترقی کے لئے ہمہ تن مصروف رہتی ہیں۔وہ مختلف علمی و ادبی اداروں اور انجمنوں سے بھی وابستہ ہیں اور اپنی خدمات انجام دے رہی ہیں۔ان کی علمی و ادبی خدمات پر انہیں ۱۹۹۴ء میں ''امتیاز میر'' جیسے اعزاز سے سرفراز کیا گیا۔اس کے علاوہ انہیں ادبی کارناموں پر مختلف اکیڈمیز نے ایوارڈ سے نوازا ہے۔

پروفیسر اشرف رفیع کا ذہن بچپن ہی سے شاعری کی طرف مائل تھا۔نویں جماعت میں ہی تھیں کہ ''شام'' عنوان سے ایک نظم لکھ ڈالی جو رسالہ ''آج کل'' میں شائع ہوئی۔اس کے بعد ان کے تخلیقی دور کا آغاز ہوا جو مسلسل چلتا رہا اور وہ اپنی ادبی صلاحیتوں کو قلم کے ذریعے تحریری صورتوں میں پیش کرنے لگیں جس کی بدولت مختلف تخلیقات منظر عام پر آئیں۔دکنیات، لسانیات، تحقیق و تنقید کے موضوعات پر لکھنے کے علاوہ، بچوں کے ادب سے بھی خاص دلچسپی رکھتی ہیں۔حکومت کی جانب سے اردو کی مرتب کی جانے والی (اوّل تا پنجم) کتابوں کی وہ چیف ایڈیٹر بھی رہی ہیں۔نصابی کتابوں کی کمیٹی کی چیئر پرسن کی حیثیت سے بھی خدمات کو انجام دیا ہے۔تعلیم بالغاں کے ایڈیٹوریل بورڈ کی ممبر رہیں۔علاوہ ازیں لسانیات، تحقیق و تنقید پر بے شمار مضامین رسائل و اخبارات میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ان کی تصانیف یوں ہیں:

۱۔تلخیص عروض و قافیہ (۱۹۸۲)،۲۔عود غزل ۱۹۸۳ (شاعری کا مجموعہ)، ۳۔مقالات

طباطبائی (۱۹۸۴)، ۴۔دکنی مثنویوں کا انتخاب (۱۹۹۰)، ۵۔تلاش زبان و ادب ۱۹۹۹ (تحقیقی و تنقیدی مضامین کا مجموعہ)، ۶۔نظم طباطبائی (۱۹۷۳)۔

پروفیسر اشرف رفیع دکنیات کے علاوہ لسانی تحقیق میں مقبولیت کا درجہ رکھتی ہیں۔ حالانکہ لسانیات جیسے خشک موضوع کے لیے بہت کم فطرتیں مناسب پاتی ہیں۔انہیں لسانیات کے موضوع پر بھی خاصا عبور حاصل ہے اور ساتھ ہی ساتھ وہ تنقید پر بھی دسترس رکھتی ہیں۔

پروفیسر اشرف رفیع کا پی۔ایچ۔ڈی کی سند کیلئے تحریر کردہ مقالہ ''نظم طباطبائی'' ۱۹۷۳ء میں طباعت کے مرحلے کی تکمیل کے بعد منظر عام پر آیا۔اس کتاب میں انہوں نے نظم طباطبائی کثیر الجہات شخصیت کے تمام پہلو پر نظر ڈالی ہے جس میں نظم طباطبائی کی حیات اور شخصیت بحیثیت مترجم، معلم شاعر، نقاد، سوانح نگار مورخ، علم فلکیات کے طالب علم اور عروض ولسانیات کے استاد، غرض کہ انکی شخصیت کے تمام پہلوؤں کو موضوع بحث بنایا ہے۔ڈاکٹر اشرف رفیع نے نظم طباطبائی کی ہمہ جہت شخصیت کے تمام پہلوؤں کو بڑی خوبیوں سے سمیٹا ہے۔اور ان کی نثر و نظم پر محققانہ و ناقدانہ نظر ڈالی جس کے نتیجے میں اس کتاب کو نہایت وقیع و مبسوط اور تحقیقی کتاب کا درجہ دیا گیا ہے۔

آمنہ ابوالحسن

آزادی کے بعد حیدرآباد کی خاتون افسانہ نگار اور ناول نگار خواتین میں آمنہ ابوالحسن کو نمایاں حیثیت حاصل ہے۔ان کا اصل نام سید آمنہ بانو اور قلمی نام آمنہ ابوالحسن تھا۔۱۰رمئی ۱۹۴۱ء کو حیدرآباد کے علمی گھرانے میں پیدا ہوئیں۔آمنہ ابوالحسن کی والدہ کا انتقال ان کے بچپن ہی میں ہو گیا تھا اور یہ والد صاحب کے زیر سایہ تعلیم و تربیت پاتی رہیں۔ان کے والد مولوی ابوالحسن سید علی صاحب کا شمار حیدرآباد کے سرکردہ ایڈوکیٹس میں ہوتا تھا۔آپ کے والد نامور قانون اور سیاستداں ہونے کے ساتھ ساتھ سیاسی رہنما بھی تھے۔

آمنہ ابوالحسن کی شخصیت پر ان کے گھرانے کا ادبی ماحول بہت حد تک اثر انداز ہوا۔انٹرمیڈیٹ

تک تعلیم حاصل کرنے کے بعد ان کی شادی ۲۵ / مارچ ۱۹۳۵ء کو جناب مصطفیٰ علی اکبر سے ہوگئی جو ایک جرنلسٹ ہیں۔ آمنہ ابوالحسن کو بچپن سے ہی لکھنے کا شوق پیدا ہوا اور انہوں نے مشن اسکول کے دور سے ہی لکھنے کا آغاز کر دیا۔ ان کی پہلی کہانی 'ننھی کلی' کے نام سے بچوں کے ایک رسالے میں شائع ہوئی جو ایک کہانی کی حیثیت رکھتی ہے۔ اسکے بعد انہوں نے باضابطہ طور پر لکھنا شروع کیا۔ ابتدائی دنوں میں رومانی افسانے لکھے لیکن جس عہد میں انہوں نے افسانہ نگاری کی ابتدا کی ترقی پسند تحریک کا دور تھا۔ اس تحریک سے متاثر ہوکر، سماجی اور معاشرتی مسائل کو مدنظر رکھتے ہوئے بے شمار ادبی تخلیقات منظر عام پر آ رہی تھیں۔ آمنہ ابوالحسن کو بھی کچھ تو اس دور کی ادبی فضا نے متاثر کیا اور کچھ فرانسیسی اور روسی ادیبوں کی تخلیقات کے مطالعہ نے انہیں ذہنی طور پر متحرک کرنے کا کام کیا۔ انہوں نے اپنے اطراف کی بکھری ہوئی زندگی میں پیش آنے والے واقعات کو اپنے افسانے کی بنیاد بنایا۔

آمنہ ابوالحسن نے ناول اور افسانے کے علاوہ چند سائنسی مضمون اور مقالے بھی لکھے ہیں جس سے اندازہ ہوتا ہے ادب کی دوسری اصناف پر بھی انہیں کافی عبور حاصل تھا۔ ان کے دو افسانوی مجموعے ''کہانی'' اور ''بائی فوکل'' ہیں۔ اس کے علاوہ سیاہ سرخ سفید، تم کون ہو، مہک، وہ اور میں، یادش بخیر اور پلس مائنس ناول ہیں۔ ''واپسی'' کے عنوان سے ایک ناولٹ بھی لکھا ہے۔ اس کے علاوہ ان کے کئی افسانے ہندوستان و پاکستان کے کئی رسائل میں شائع ہوئے۔

آمنہ ابوالحسن کے ناول سیاہ سرخ سفید، تم کون ہو، واپسی، وہ اور میں اور یادش بخیر ان کے بہترین ناول تسلیم کیے جاتے ہیں۔ انھوں نے شعور کی رو کی تکنیک اپنے ناولوں میں اپنا کر تکنیک کے تجربے بھی کئے ہیں۔ ان کا پہلا ناول سیاہ سرخ سفید، نیشنل بک ڈپو حیدرآباد شائع ہوا۔

آمنہ ابوالحسن کے ادبی سفر کا آغاز افسانہ نویسی سے ہوا تھا۔ ان کا پہلا افسانوی مجموعہ ''کہانی'' کے نام سے منظر عام پر آیا لیکن رفتہ رفتہ ان کا رجحان ناول کی طرف مائل ہوگیا اور یہی وجہ ہے کہ ''کہانی'' کے بعد سلسلے وار چار ناول لکھ ڈالے۔ آمنہ ابوالحسن کے چند حسب ذیل افسانے جنکا شمار اردو ادب کے مقبول افسانوں میں ہوتا ہے یوں ہیں:

طواف، ایک بوند عطر کی، بائی فوکل میری میا، پورٹریٹ، اڑان، سون، نروان، ایکس وائی زیڈ، پاکھنڈی، تنکو، اس نے دیکھا، آوا، منظر، گیت، سچائی کا بوجھ، وغیرہ۔

آمنہ ابوالحسن فنون لطیفہ موسیقی اور مصوری میں بھی کافی دلچسپی رکھتی تھیں۔ ان کے مزاج میں انتہاپسندی شامل تھی مگر صبر وتحمل اپنے والد اور پھر شوہر سے ملا۔ قانون داں والد اور صحافی شوہر کے منفرد شعبوں نے ان کی شخصیت کے فروغ میں کافی اہم کردار ادا کیا۔ ان کے شوہر ہمیشہ ان کے ادبی شہ پاروں کا احترام کیا کرتے تھے۔

آمنہ ابوالحسن کے اطراف واکناف میں رونما ہونے والے واقعات جب پوری طرح ذہن پر اثر انداز ہوتے ہی وہ افسانہ لکھنے پر آمادہ ہوتیں۔ انہوں نے اپنی خواہش اور اپنے کرب کو سمیٹنے کے لیے ہی لکھا۔ کبھی بھی کسی کی فرمائش یا خواہش کے تحت نہیں لکھا۔

آمنہ ابوالحسن کو مصوری اور موسیقی سے حددرجہ دلچسپی ہونے کے باعث کئی افسانوں کی تخلیق ہوئی۔ ان کے افسانے گیت، منظر، سچائی کا بوجھ میں منظر کشی ایک عمدہ انداز میں پیش کی گئی ہے اور اس سے پیار ومحبت کے لطیف جذبوں کو ابھارا گیا ہے۔

انہوں نے شہری زندگی سے ہٹ کر دیہاتی زندگی کے مسائل کو بھی اپنے افسانوں میں پیش کیا۔ وہاں کے کھیت کھلیان، دیہات کا پس منظر، وہاں کی بولیوں کا ذکر ان کے افسانے آوا، برجو، لیبل اور میری میا میں بہترین انداز میں تجزیہ کیا گیا ہے۔ ''کہانی'' کا شمار بیانیہ کہانیوں کے زمرے میں آتا ہے۔ انہوں نے شعور کی رو سے کام لیتے ہوئے کہانی کا تانا بانا تیار کیا ہے۔

آمنہ ابوالحسن کو ان کی ادبی خدمات کی بنا پر اردو اکیڈمی آندھرا پردیش اردو اکیڈمی مغربی بنگال، یوپی اردو اکیڈمی اور دہلی اردو اکیڈمی نے انہیں مختلف ایوارڈ سے نوازا۔

غرض آمنہ ابوالحسن نے اپنے ادبی ذمہ داری قبول کرتے ہوئے لاجواب تخلیقات کے ذریعے سماجی مسائل اور زندہ حقیقتوں سے ہمیں روشناس کرایا اور ادب میں اپنی ایک علیحدہ پہچان بنائی۔ ادب کا یہ روشن ستارہ ۹ راپریل ۲۰۰۵ء کو غروب ہوگیا۔

باب سوم

زینت ساجدہ کے انشائیوں کا تنقیدی مطالعہ

زینت ساجدہ کے انشائیوں کا تنقیدی مطالعہ

زینت ساجدہ حیدرآباد کی خواتین ادیبوں میں ایک اہم نام ہے۔انہوں نے اپنے ادبی سفر کا آغاز افسانہ نگاری سے کیا ہے ان کا افسانہ ارشی اپنے زمانے میں بہت مقبول ہوا اور ان کے افسانوں کا مجموعہ ''جلترنگ'' کے عنوان سے شائع ہو چکا ہے۔انہوں نے نہ صرف افسانے لکھے بلکہ تحقیق و تنقید کے میدان میں بھی قدم رکھا۔کلیاتِ شاہی، نوسرہار اور مثنوی من لگن ان کی تحقیقی تصانیف ہیں۔زینت ساجدہ ایک اچھی مزاح نگار بھی ہیں انہوں نے دلچسپ مزاحیہ مضامین بھی لکھے ہیں۔زینت ساجدہ نے نہ صرف مزاحیہ مضامین لکھے بلکہ خاکے بھی لکھے ہیں۔ان کا خاکہ مخدوم محی الدّین اپنے زمانے میں کافی مقبول ہوا۔زینت ساجدہ ایک انشائیہ نگار کی حیثیت سے بھی شہرت رکھتی ہیں۔

زینت ساجدہ نے پہلا انشائیہ ''اگر میں مرد ہوتی'' لکھا ہے۔جو اگست۔ستمبر ۱۹۴۵ء میں شائع ہوا۔ان کے انشائیوں کا ایک مجموعہ ''اسلوب بیان اور'' کے عنوان سے ۲۰۰۹ء میں شائع ہوا۔اس مجموعے میں کل سترہ (۱۷) انشائیے شامل ہیں۔مثلاً اگر اللہ میاں عورت ہوتے، بی جمالو، مکان بنا ڈالا، گنڈی پیٹ کا پانی، چار مینار پر غلاف، خالہ ماں سلام، دیکھا دیکھی، میں نے نوکری کی، میری مرغیاں، وغیرہ۔ان کے انشائیوں کی خاص بات یہ ہے کہ وہ سادہ سلیس زبان میں کسی موضوع پر اپنے خیالات کا اظہار برملا کرتی ہیں یعنی کسی موضوع کے متعلق بات کرتے وقت وہ بات سے بات بڑی آسانی سے پیدا کرتی ہیں اور اپنی رائے کا اظہار کھل کر کرتی ہیں۔

انشائیے کے لیے باقاعدہ کوئی اصول نہیں ہیں۔لیکن ناقدین چند خصوصیات بتاتے ہیں۔مثلاً سلیم اختر نے اس کی فہرست سازی کرتے ہوئے لکھا ہے:

> ''اختصار، غیر رسمی طریق کار، اسلوب کی شگفتگی، عدم تکمیل کا احساس، شخصی نقطہ نظر اور عنوانات کا موضوع سے ہم آہنگ نہ ہونا۔ گویا ان تمام اجزا کے حسین اور

فنکارانہ امتزاج سے جنم لینے والا فن پارہ انشائیہ ہوگا۔'' ۱؎

زینت ساجدہ کے انشائیوں کے مطالعہ سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ ان کے انشائیوں میں مندرجہ بالا خصوصیات بدرجہ اتم موجود ہیں۔ یہاں ان کے انشائیوں کا تنقیدی مطالعہ پیش کیا جارہا ہے۔

اختصار

انشائیہ کے لیے پہلی شرط اختصار مانا جاتا ہے کیونکہ مغربی انشائیہ نگار بیکن اور اڈیسن کے انشائیوں میں یہ بدرجہ اتم پائی جاتی ہے۔ اردو میں وزیر آغا، نظیر صدیقی، انور سدید اور زماں آزردہ سبھی کے یہاں یہ خصوصیت پائی جاتی ہے یہی وجہ ہے کہ ناقدین نے اس بات پر زور دیا ہے کہ انشائیہ کی کامیابی کا انحصار اختصار میں پوشیدہ ہوتا ہے۔ مثلاً سلیم اختر لکھتے ہیں:

''اکثر لوگ اس بات سے متفق ہیں کہ انشائیہ میں ایجاز و اختصار بہت ضروری ہے وجہ یہی کی قاری طول کلام سے اکتا نہ جائے اور لکھنے والے سے ہمدردی ضائع نہ ہوجائے۔'' ۲؎

انشائیہ دراصل دریا کو کوزے میں بند کرنے کا نام ہے۔ انشائیہ جو کہ مختصر ہوتا ہے اس لیے انشائیہ نگار اپنے تجربات و مشاہدات کو بڑی فنکاری سے اپنے انشائیہ میں سمونے کی کوشش کرتا ہے۔ وزیر آغا نے اس کی خصوصیت کی وضاحت بڑی عمدگی سے کی ہے:

''انشائیہ کی اس روش کا نتیجہ انشائیہ کی وہ مخصوص صورت بھی ہے جو اسے دوسری اصناف ادب سے ممیّز کرتی ہے یعنی ایک انشائیہ نثر کی دوسری اصناف سے اختصار کے باعث علیحدہ نظر آتا ہے۔'' ۳؎

اس اقتباس سے واضح ہوتا ہے کہ انشائیہ نگار کا مطالعہ وسیع ہو گہرے جذبات و مشاہدات کا حامل ہو اور اس کی فکر تخیل بلند ہو، تا کہ اس کے پاس کہنے کو مواد بہت ہو لیکن بڑی چابکدستی سے اپنے خیالات کو

۱؎ ڈاکٹر سلیم اختر، انشائیہ کی بنیاد، عفیف پرنٹرس، دہلی، ۲۰۱۴ء، ص ۱۶۹

۲؎ ڈاکٹر سلیم اختر، انشائیہ کی بنیاد، عفیف پرنٹرس، دہلی، ۲۰۱۴ء، ص ۱۷۴

۳؎ وزیر آغا، انشائیہ کے خدوخال، لبرٹی آرٹس پریس، دہلی، ۱۹۹۱ء، ص ۱۲

بڑی آسانی سے کم سے کم لفظوں میں بیان کرنے پر قدرت رکھتا ہو۔

انشائیہ اختصار کا دوسرا نام بھی ہے اور اردو ادب میں شاعری ایک ایسی صنف ہے جس میں بھی اختصار سے کام لیا جاتا ہے اور بڑی سے بڑی بات کو چند لفظوں کے دھاگوں میں پرویا جاتا ہے جس طرح شاعر کا ہر مصرع اور اسکی سوچ کے کئی پہلو اس کے چند مصرعوں میں نظر آتے ہیں بالکل اسی طرح انشائیہ میں موجود مختصر جملے اپنے اندر بہت وسعت رکھتے ہیں اور قاری کو غور وفکر کی طرف راغب کرتے ہیں۔

انشائیہ کی خصوصیت کے ضمن میں ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کی یہ ایک ایسا نثر پارہ ہے جو اپنی طوالت کے اعتبار سے آدھ صفحہ سے لے کر بیس یا زیادہ سے زیادہ پچیس صفحات کی وسعت رکھتا ہے کیوں کہ اس صنف کا زیادہ طویل ہونا اسی طرح قاری کے ذہن پر گراں گزرتا ہے جس طرح غزل میں ضرورت سے زیادہ اشعار کا ہونا۔

زینت ساجدہ کے انشائیوں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس ہنر سے اچھی طرح واقف ہیں ان کا مطالعہ وسیع ہے جس موضوع پر اظہار خیال کرتی ہیں اس کا حق ادا کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔ اختصار اور جامعیت ان کے انشائیوں میں بجا طور پر نظر آتا ہے۔ انشائیہ ’’مکان بنا ڈالا‘‘ کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو جس میں انہوں نے گھر بنانے کے لیے چند چیزوں کو ضروری مانا ہے جسے اپنے تجربات و مشاہدات کی روشنی میں یوں سمجھنے کی کوشش کی ہے:

> ’’باورچی خانے میں ساری عصری سہولتیں موجود رہیں تا کہ نوکر نہ ہو تو ہم خود آسانی سے پکوان کر لیں، چھوٹا دالان مفلسی کی نشانی، بڑا دالان بنائیں گے، دعوتوں کی سہولت رہے گی، نئی چھتوں سے ہمارا دم گھٹتا ہے، چھتیں اونچی ہونی چاہیے، اندر کے آنگن میں آم اور نیم کے گھنے پیڑ ہوں گے تو گرمی میں سایہ رہتا ہے۔‘‘ [1]

اسی انشائیہ میں ایک اور جگہ انہوں نے اختصار اور جامعیت کا ثبوت پیش کرتے ہوئے اپنے تجربات کو قلمبند کیا ہے۔ مثال کے طور پر اقتباس پیش ہے:

[1] مکان بنا ڈالا، اسلوب بیان اور، اردو مجلس، حیدر آباد، ۲۰۰۹ء، ص ۴۴

''میں نے سوچا دور کیوں جائیں اپنے ہی محلے میں لے لیں گے محلّہ اچھا، صاف ستھرا، ملنے ملانے والے سب قریب ہی رہتے ہیں، بازار پاس ہے۔ اسکول کالج دور نہیں، نوکر آسانی سے مل جاتے ہیں ایک دن محلّہ پر گھوم آئے۔ مگر یہ کیا؟ کچھ دنوں پہلے جگہ جگہ زمین برائے فروخت کا اشتہار لگا رہتا تھا، قیمتیں واجبی تھیں۔ مگر جیسے ہی معلوم ہوا کہ ہم جیسوں نے بھی مکان بنانے کا ارادہ کیا ہے تو قیمتیں آسمان سے باتیں کرنے لگیں۔ سڑک کے کنارے تو ہم ہنگامے کے خیال سے گھر بنانا ہی نہیں چاہتے تھے مگر گلیوں میں بھی زمین کی جو قیمت تھی سن کر چونک اٹھے۔ کانوں پر اعتبار نہ آتا۔'' ۱

انشائیہ ''خالہ ماں سلام'' میں بھی اختصار کی صفت نظر آتی ہے جس میں انہوں نے اپنے تجربات کو بڑی بے باکی سے طنز و مزاح کے انداز میں قاری کی نذر کیا ہے۔ مثال کے طور پر اقتباس ملاحظہ ہو:

''امتحان میں اگر ہمارے گیس کے سوالات آ گئے تو ماشاءاللہ ہر ملنے والی سے ذکر ہوگا، اخلاق کے قصیدے پڑھے جائیں گے کامیابی کا سہرا ان کے سر اور فاضل دعائیں ہمارے حصے میں آئیں گی۔ ہماری ذہانت کا لوہا بھی خود مانے گی اور ہر ایرے غیرے سے منوائیں گی اور بات شدہ شدہ یونیورسٹی پہنچے گی اور لوگ باگ چپکے چپکے سرگوشیاں کریں گے کہ ہم گیس پیپر بھی بناتے ہیں۔ نتیجہ معلوم اگر خدانخواستہ دور پار دشمن، شیطان کے کان بہرے، ان کی جان سے دور ہماری جان سے نزدیک، نتیجہ الٹا نکلا تو پھر کچھ بھی نہ پوچھیے اللہ دے اور بندہ لے، صلواتیں ہیں، گالیاں ہیں، کوسنے ہیں، دھوکہ باز گویا جان بوجھ کر جل دیا پشتینی دشمنی نکالی۔'' ۲

اس کے علاوہ اختصار کی مثالیں ان کے دیگر انشائیے میں نے نوکری کی، دیکھا دیکھی، کباڑ خانے سے میوزیم تک، وغیرہ میں نظر آتی ہیں۔

۱۔ مکان بنا ڈالا، اسلوب بیان اور، اردو مجلس، حیدرآباد، ۲۰۰۹ء، ص ۴۴

۲۔ خالہ ماں سلام، اسلوب بیان اور، اردو مجلس، حیدرآباد، ۲۰۰۹ء، ص ۷۱

غیر رسمی انداز

انشائیہ کی دوسری شرط اس کا غیر رسمی انداز ہے یعنی انشائیہ نگار اپنے اسلوب کی بدولت ایسا طریق کار اختیار کرے کہ قاری کو وہ اپنے اعتماد میں لے لے۔ تمام ناقدین کا اس بات پر اتفاق ہے کہ انشائیہ نگار کے مقاصد جدا ہوتے ہیں اور اس مقصد کی تکمیل کے لئے انشائیہ نگار کو غیر رسمی طریق کار اختیار کرنا ہوتا ہے جو قاری کے دل پر ثبت کر جائے۔ غیر رسمی طریق کار اختیار کرتے وقت انشائیہ نگار یا تو اسلوب میں شگفتگی پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے یا اصل موضوع سے ہٹ کر دوسرے موضوع کی طرف رجوع کرتا ہے جس سے تحریر میں بے ترتیبی یا بے ربطگی پیدا ہوتی ہے لیکن یہ بے ترتیبی قاری کے ذہن پر گراں نہیں گزرتی۔ ڈاکٹر سلام سندیلوی نے اس کی اہمیت کو یوں واضح کیا ہے:

> ''انشائیہ کی اصل روح، یہی غیر رسمی انداز بیان ہے۔ اس بنا پر CRABBLE اس کو ایک آسان فن تصور کرتا ہے مگر SAINT-BEUVE کی نظر میں یہ ایک مشکل فن ہے انشائیہ میں غیر رسمی انداز بیان اس طرح بھی داخل ہو جاتا ہے کہ انشا پرداز اصل موضوع سے ہٹ کر اپنے دیگر تجربہ بھی بیان کرنے لگتا ہے۔ یہ تجربات وہ دوسری جگہ بیان کرنے سے قاصر رہتا ہے کیونکہ ہر صرف اتنی لچیلی اور ڈھیلی نہیں ہوتی ہے جو اس کو موضوع سے ہٹی ہوئی باتوں کے ذکر کی اجازت دے اس کی اجازت صرف انشائیہ دے سکتا ہے۔'' [1]

انشائیہ کی بے ترتیبی کی صفت پر روشنی ڈالتے ہوئے غلام جیلانی اصغر نے یوں لکھا ہے:

> ''انشائیہ ایک ایسی نثری صنف ہے جو اتنی ہی بے ربط ہے جتنی کی زندگی خود اور جس طرح زندگی کے آخر میں حیاتیاتی وحدت وجود میں آتی ہے اسی طرح انشائیے کے منتشر اجزاء میں دیکھتے ہی دیکھتے ایک وحدت تاثر پیدا ہو جاتی ہے۔ زندگی خود ایک اجزاء سے عبارت ہے۔ انشائیہ کی یہی خوبی یا خصوصیت ہے۔ یہ اجزائے فکری بھی ہوتے ہیں اور جذباتی بھی یعنی انشائیہ سوچنے پر بھی

[1] ادب کا تنقیدی مطالعہ، بحوالہ ڈاکٹر سلیم اختر، انشائیہ کی بنیاد، عفیف پرنٹرس، دہلی، ۲۰۱۴ء، ص ۳۰۴

مجبور کرتا ہے اور محسوسات کے وسیع تر امکانات بھی چھوڑ جاتا ہے۔ آپ جب انشائیہ ختم کر لیتے ہیں تو آپ کی سوچ کو ایک نیا اور غیر رسمی سا زاویہ مل جاتا ہے۔'' [1]

انشائیہ کے غیر رسمی طریق کار کے ضمن میں جب ہم زینت ساجدہ کے انشائیوں کا جائزہ لیتے ہیں تو یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ انہوں نے اپنے انشائیوں میں موضوع سے انحراف کرتے ہوئے اپنی زندگی کے تجربات و مشاہدات کو بیان کیا ہے اور ان تجربات و مشاہدات کو بیان کرنے میں انہوں نے اپنی فنی مہارت کا ثبوت پیش کیا ہے۔ ان کا یہ فن کمال ہے کہ وہ عام سی یا غیر اہم بات کے نئے پہلو یا زاویہ پر روشنی ڈال کر اس کی جانب اشارہ کر کے قاری کو چونکا دیتی ہیں اور بڑی ہی سادگی کے ساتھ آگے بڑھ جاتی ہیں۔ مثال کے طور پر ''اگر اللہ میاں عورت ہوتے'' کا ایک اقتباس پیش ہے:

''باپ! وہ تو یہ بھی دیکھتا ہے کہ اس کی اولاد کس عورت سے ہے اس کی سماجی حیثیت کیا ہے اگر وہ اسے چار گواہوں کی موجودگی میں قاضی یا پنڈت منتروں سے بنا تھا تو اولاد کو بھی تسلیم کرتا ہے لیکن اس کی اولاد طوائف کے ہاں ہوتی تو حقارت کی نظروں سے دیکھتا ہے اور اگر کسی فریب خوردہ کمزور اور بے سہارا عورت سے ہوتی ہے تو مکر جاتا ہے۔ عورت نے کبھی ماں ہونے میں فرق نہیں کیا اگر اسے فطری مجبوری سمجھا جائے تو کیا کبھی ایسا بھی ہوا کہ اپنے مفاد کی خاطر اس کی مامتا میں فرق آ گیا ہو؟ نہیں ہر گز نہیں۔'' [2]

مندرجہ بالا اقتباس میں زینت ساجدہ نے اپنے سماجی مشاہدہ کو اپنے موضوع کے تحت سمیٹنے کی کوشش کی ہے اور قاری کو اس سماجی نظریہ کی طرف راغب کیا ہے اس کے علاوہ انشائیہ ''ہم ہیں تو ابھی راہ میں ہیں سنگِ گراں اور'' میں بھی انشائیہ نگار نے اپنے تجربات کو بیان کرتے وقت موضوع سے انحراف کیا ہے جس سے انشائیہ کی ہیئت میں ایک بے ترتیبی رونما ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر اقتباس ملاحظہ ہو:

''یہ تو ہوئی لکھنے پڑھنے کی بات ۔۔۔۔ مان لیا لکھنے پڑھنے کے لیے سکون کی

۱۔ غلام اصغر جیلانی، انشائیہ کیا ہے؟ اوراق، انشائیہ و افسانہ نمبر، مارچ۔ اپریل ۱۹۷۲ء، ص ۲۳۰

۲۔ اگر اللہ میاں عورت ہوتے، اسلوب بیان اور، اردو مجلس، حیدر آباد، ۲۰۰۹ء، ص ۲۱

ضرورت ہے۔ ہانڈی پکانے کے لئے تو اس کی ضرورت نہیں۔ عورتیں تو پکانا سیکھ کر پیدا ہوئی ہیں۔ آج چھٹی ہے اور موسم خوشگوار۔ سب کی فرمائش ہے کہ کچھ عمدہ پکوان ہو۔ اس لیے دو گھنٹے سے چولہے کے سامنے بیٹھے تپ رہے ہیں۔ پیاز کی بو سارے بدن پر پھیلی ہوئی ہے۔ آنکھیں بہہ رہی ہیں، ناک ٹپک رہی ہے اور بہت دل لگا کر ہانڈی بھونی جا رہی ہے۔ ہانڈی بڑے اطمینان سے چڑھائی جاتی ہے مگر اس اطمینان سے اتاری نہیں جاتی۔ اس درمیان کئی مقامات آہ وفغاں آتے ہیں۔ بچوں نے پڑوسن کے گھر میں ڈھیلا پھینکا، مرغی کا انڈا مالن چرالے گئی، بھائی جان کی کتاب رات کو میز پر رکھی تھی کہاں غائب ہوگئی، ڈاکیہ خط لایا ہے، منی نے پاندان الٹ دیا، بچہ کیچڑ میں جا گرا، وغیرہ، وغیرہ۔'' ۱؎

اس کے علاوہ ''انشائیہ چار مینار پر غلاف'' میں بھی انشائیہ نگار نے موضوع سے یعنی چار مینار کے تذکرہ سے انحراف کرتے ہوئے پی۔ ایچ۔ ڈی ریسرچ کے سلسلے میں اپنے مشاہدے کو بیان کر رہی ہیں جس سے انشائیہ میں ایک بے ترتیبی نظر آتی ہے۔ مثال کے طور پر اقتباس دیکھئے:

''آج کل ریسرچ ایسے ہی چلتی ہے۔ لوگ چیلنج کرنے سے رہے کیونکہ انہیں اپنی لاعلمی بلکہ جہالت کا خوب خوب احساس ہے کیا معلوم اسی بہانے ادب کی دنیا میں ایک بحث چھڑ جائے اور کوئی نہ کوئی پی۔ ایچ۔ ڈی کا طالب علم ثبوت وغیرہ بھی مہیا کر دے، ایک ضخیم مقالہ لکھے اور ڈاکٹر بن جائے۔ چلیے اس فکر سے تو نجات ملی۔'' ۲؎

زینت ساجدہ کے دیگر انشائیوں جیسے رہیے اب ایسی جگہ چل کر، گنڈی پیٹ کا پانی، کاہ کرو سنگھار پیا مورا اندھا، خالہ ماں سلام، میں نے نوکری کی، وغیرہ میں بھی انشائیہ نگار نے موضوع سے انحراف کرتے ہوئے اپنے تجربات ومشاہدات کو پیش کیا ہے اور یہی عنصر انشائیہ کی فنی اساس ہے۔

غیر رسمی انداز کے ضمن میں یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ زندگی کو پیچ وخم سے علیحدہ کرتے ہوئے

۱؎ ہم ہیں تو ابھی راہ میں ہیں سنگ گراں اور، اسلوب بیان اور، اردو مجلس، حیدرآباد، ۲۰۰۹ء، ص ۳۰

۲؎ چار مینار پر غلاف، اسلوب بیان اور، اردو مجلس، حیدرآباد، ۲۰۰۹ء، ص ۳۰

انشائیہ نگار قاری کو اپنے اعتماد میں لینے کی کوشش کرتا ہے۔انشائیہ نگار کا مقصد بغیر کسی دلائل کے اپنے شخصی ردعمل کو قاری کے سامنے اجاگر کرنا ہے۔ چنانچہ اس فنی خصوصیت کا ذکر کرتے ہوئے وزیر آغا نے یوں لکھا ہے:

''ایک چیز ہے جو انشائیہ کو دوسری اصناف سے ممیز کرتی ہے اس کا غیر رسمی طریق کار ہے۔ دراصل انشائیہ کے خالق کے پیش نظر کوئی ایسا مقصد نہیں ہوتا ہے جس کی تکمیل کے لئے وہ دلائل و براہین سے کام لے اور ناظر کے ذہن میں ردوقبول کے میلانات کو تحریک دینے کی سعی کرے اس کا کام محض یہ ہے کہ چند لمحوں کے لیے زندگی کی سنجیدگی اور گہما گہمی سے قطع نظر کر کے ایک غیر رسمی طریق کار اختیار کرے اور اپنے شخصی ردعمل کے اظہار سے ناظر کو اپنے حلقہ احباب میں شامل کرلے۔'' [1]

اس اقتباس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ انشائیہ نگار کو اپنے مقصد کی تکمیل کے لئے دلائل و براہین کا سہارا نہیں لینا پڑتا ہے بلکہ وہ خوش مزاجی کی کیفیت میں اپنے تجربات ومشاہدات کو قلم بند کرتا ہے اور قاری کو لطف ومسرت عطا کرتا ہے۔ اپنے تجربات و مشاہدات کو بیان کرتے وقت انشائیہ نگار بہت ساری ایسی باتوں کو بیان کرتا ہے جو بظاہر غیر منطقی اور بے بنیاد معلوم ہوتی ہیں اور انہیں عقلی طور پر تسلیم نہیں کیا جاسکتا لیکن وہ یہ سب کچھ قاری کو اپنے اعتماد میں لینے کے لیے کرتا ہے۔اس سلسلے میں ڈاکٹر سلیم اختر یوں لکھتے ہیں:

''انشائیہ نگار کی حالت تو اس اس شخص کی سی ہوتی ہے جو کسی عمدہ وخوشگوار موڈ میں بیٹھا ہے اور اپنے کسی بے تکلف دوست سے ایسے ہی خوشگوار لہجے میں باتیں کئے جارہا ہے۔اس لحاظ سے ہم اسے کسی حد تک ڈرامائی خود کلامی سے بھی مشابہہ قرار دے سکتے ہیں۔لیکن انشائیہ نگار ڈرامہ نگار کی طرح پابند نہیں ہے۔خود کلامی صرف ایک کردار کے احساسات اور ردعمل کے لیے ہوتی ہے۔مثلاً انشائیہ بظاہر

[1] وزیر آغا، انشائیہ کے خدوخال، لبرٹی آرٹس پریس، دہلی، ۱۹۹۱ء، ص ۹۔۱۰

غیر منطقی اور غیر عقلی بھی ہوسکتا ہے لیکن یہ سب کچھ دوسروں کے خیال میں ہوگا۔'' ؎۱

مندرجہ بالا اقتباس سے واضح ہے کہ انشائیہ ایک خوشگوار موڈ میں بیٹھے ہوئے شخص کی تحریری پیداوار ہے جو اپنی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کو بے نقاب کرنے کے لیے وہ کسی بھی استدلال اور براہین کا متحمل نہیں ہے۔ انشائیہ نگار قاری کو اپنا جگری دوست تصور کرتے ہوئے بے باکی کے ساتھ باتیں کرتا جاتا ہے جس سے اس کی شخصیت کا ظہور ہوتا ہے۔ اور قاری بھی انشائیہ نگار سے یہی امید کرتا ہے کہ وہ اس سے دوست جیسا برتاؤ کرے یا انشائیہ کی تحریر سے خوش کرے اور جس موضوع پر انشائیہ نگار لکھ رہا ہے اس میں نئی فکر اور روشنی ڈال دے یعنی کہ قاری انشائیہ نگار پر اپنا حق سمجھتا ہے اور وہی سب کچھ لکھوانا چاہتا ہے جو اسے پسند ہے جس سے اس کو خوشی بھی محسوس ہوتی ہو اور انشائیہ نگار بھی اپنے تجربات واحساسات کو بڑی بے تکلفی کے ساتھ قاری کو قریبی دوست کا درجہ دیتے ہوئے قلم بند کرتا جاتا ہے اور یہ جذبہ انشائیہ کو دوسری صنف سے بلند کرتا ہے۔

زینت ساجدہ کے انشائیوں کے مطالعے سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ انہوں نے بھی اپنے تجربات ومشاہدات کو بیان کرتے وقت موضوع کے ضمن میں بات سے بات پیدا کرنے کی کوشش کی ہے اور ایسی باتوں کا ذکر کیا ہے جس میں استدلال کی کمی نظر آتی ہے اور دماغ اس کو قبول کرنے پر آمادہ نہیں ہوتا ہے۔ لیکن یہ بے عقلی اور غیر منطقی باتیں قاری کو بوجھل نہیں لگتیں۔ زینت ساجدہ اپنے اس فن کی بدولت قاری کو اعتماد میں لینے میں کامیاب نظر آتی ہیں۔ مثال کے طور پر انشائیہ ''گنڈی پیٹ کا پانی'' کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو جو منطق اور عقلی دلیل سے خالی نظر آتا ہے:

> ''یا ادھر دیکھیے سر پر گٹھری اٹھائے ننگے بدن چیتھڑے لپیٹے چلے آرہے ہیں۔ پاؤں میں جوتا چھوڑ چپل تک نہیں۔ عابد روڈ پر کھڑے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ادھر ادھر دیکھ رہے ہیں۔ کمر کی گانٹھ سے ٹٹول ٹٹول کر بڑی مشکل سے دو پیسے نکالے اور چنے خرید کر کھائے گنڈی پیٹ کا پانی پاس ہی کے کسی نل سے منہ لگا کر

؎۱ ڈاکٹر سلیم اختر، انشائیہ کی بنیاد، عفیف پرنٹرس، دہلی، ۲۰۱۴ء، ص ۱۷۵

پیا اور زور شور کی ڈکار لی۔۔۔۔۔لیکن یہ کیا اس جادو بھرے پانی نے تو وہ کمال کیا
کہ ہیئت ہی بدل گئی۔۔۔۔اور اب ان کا اپنا بنگلہ ہے، بنگلے پر موٹر، موٹر کے لئے
شوفر، پھاٹک پر چوکیدار، جان برٹن کا نہ سہی صدیق کا سلا ہوا بڑھیا سوٹ، پاؤں
میں جوتا ایسے چھک چھک چمک رہا ہے جیسے گنڈی پیٹ کے پانی کے اثر سے انکا
اپنا منہ۔'' [1]

مذکورہ بالا اقتباس میں انشائیہ نگار نے گنڈی پیٹ کے پانی کا ذکر کرتے ہوئے ایسی باتیں کہہ ڈالی جس سے قاری کو مسرت تو حاصل ہوتی ہے لیکن دماغ اس کو تسلیم نہیں کرتا ہے۔اس سلسلے میں ان کے ایک اور انشائیہ ''چار مینار پر غلاف'' کا ایک اقتباس پیش ہے:

''بس اب اس سے پہلا کام یہ کریں کہ خود کو اس کا وارث قرار دے
لیں۔بادشاہوں نہ سہی ان کے بتانے والے معماروں میں ڈھونڈنے پر کوئی نہ
کوئی اپنا نکل ہی آئے گا۔تحقیق تفتیش کی ضرورت ہی کیا ہے۔ہم کہہ دینگے فلاں
نایاب تاریخ کے فلاں گم شدہ صفحے پر ہمارا حق وراثت درج ہے۔چلیے چھٹی ہوئی
کوئی چوں تک نہ کرے گا۔' [2]

دراصل انشائیہ نگار چار مینار کی سرپرستی حاصل کرنے کی کوشش میں ہے اور اس کے لیے وہ خود کو چار مینار کے کسی معمار کا وارث ہونے کی بات کرتی ہیں اور اس ضمن میں وہ بہت ساری ایسی غیر منطقی باتیں بھی کہہ ڈالی جن کو قاری کا ذہن قبول کرنے پر آمادہ نہیں ہوتا ہے لیکن اس فنی صفت کی بدولت وہ قاری کو اپنے احباب میں شامل کرتے ہوئے نظر آتی ہیں۔

زینت ساجدہ نے قاری کو اعتماد میں لینے اور مسرت بخشنے کے لئے اپنے انشائیوں میں موضوع کے حوالے سے بہت ساری ایسی چیزوں کا بھی ذکر کیا ہے جو ظاہری طور پر قاری کو لطف اندوز تو کرتی ہیں لیکن عقلی طور پر قاری کا ذہن اس کو قبول کرنے سے قاصر ہوتا ہے۔غیر رسمی طریق کار کی یہ صفات زینت ساجدہ کی انشائیوں میں جگہ جگہ نظر آتی ہے۔

۱۔ گنڈی پیٹ کا پانی، اسلوب بیان اور، اردو مجلس، حیدرآباد، ۲۰۰۹ء، ص ۵۶

۲۔ چار مینار پر غلاف، اسلوب بیان اور، اردو مجلس، حیدرآباد، ۲۰۰۹ء، ص ۵۹

اسلوب کی شگفتگی

انشائیہ کے فن میں ایک اہم خصوصیت اسلوب کی شگفتگی ہے جو انشائیہ نگار کے غیر رسمی انداز اختیار کرنے سے حاصل ہوتی ہے۔ انشائیہ نگار اسلوب کی شگفتگی کی بنا پر ہی قاری کو اعتماد میں لینے کی کوشش کرتا ہے لیکن انشائیہ نگاری کے مقاصد دیگر اصناف سے جداگانہ ہیں اس لئے انشائیہ کا اسلوب بھی دیگر اصناف سے مختلف ہوتا ہے جسے انشائیہ نگار اپنے مقاصد کو سامنے رکھ کر اختیار کرتا ہے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر سلیم اختر لکھتے ہیں:

''انشائیہ کے اسلوب اور دیگر اصناف کے اسلوب میں ایک بنیادی فرق بھی ہے۔ ایسا فرق جسے کسی حد تک انشائیہ ہی سے مخصوص قرار دیا جا سکتا ہے اور یہ ہے کہ انشائیہ نگار کا طریقہ گفتار جسے بالعموم غیر رسمی، شگفتگی، ہلکے پھلکے غیر سنجیدہ، آزاد روی لچک اور اس سے ملتے جلتے الفاظ سے واضح کیا جاتا ہے۔'' ١؎

انشائیہ کے تمام ناقدین اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ انشائیہ نگار کے مقاصد مقالہ نویس یا مضمون نگار کے مقاصد سے جدا ہوتے ہیں اور اسی بنا پر انشائیہ اور مضمون نگاری کی خصوصیات میں بھی فرق اسلوب کی شگفتگی پر مبنی غیر رسمی طریق کار سے ہی نظر آتا ہے۔ انشائیہ میں ہلکی پھلکی، بے تکلفانہ اور غیر سنجیدہ باتیں صرف اسی لچک کے باعث ممکن ہیں۔

انشائیہ نگار موضوع کو لطیف اور دلکش بنانے کے لئے مختلف لفظوں کی رنگینیوں کو استعمال میں لاتا ہے جو قاری کو مسرت بخشتی ہیں۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر سلیم اختر کا قول ملاحظہ ہو:

''اگرچہ انشائیہ کی تکنیک اور مقاصد کے بارے میں ناقدین میں عمومی اتفاق نہیں پایا جاتا لیکن جہاں تک اس کے اسلوب کا تعلق ہے تو سبھی لکھنے والوں نے اس امر کی توثیق کی ہے کہ انشائیہ کے اسلوب میں لطافت اور شگفتگی ہونی چاہیے۔ لطافت ایسی کہ انشائیہ متبذل نہ ہو جائے اور شگفتگی ایسی کہ مزاح نہ ہونے کے

١؎ ڈاکٹر سلیم اختر، انشائیہ کی بنیاد، عفیف پرنٹرس، دہلی، ۲۰۱۴ء، ص ۳۰۳

باوجود بھی تحریر فرحت بخش ہو۔'' ۱؎

انشائیہ کی اس تکنیک کو استعمال میں لانا ایک مشکل عمل ہوتا ہے لیکن انشائیہ کی کامیابی کا دارومدار بھی اسی فن پر منحصر ہے بعض اوقات انشائیہ نگار انشائیہ کے اسلوب میں لطافت اور شگفتگی پیدا کرنے سے قاصر رہ جاتا ہے یعنی وہ بات تو کہہ جاتا ہے لیکن بات کو کہنے کے انداز سے واقفیت نہیں ہوتی ہے جس کی بنا پر انشائیہ ناکامی کا شکار ہو جاتا ہے اسی تناظر میں انشائیہ کے اسلوب کا ذکر کرتے ہوئے سید صفی مرتضٰی کی کتاب ''اردو انشائیہ'' کے تعارف میں سید احتشام حسین لکھتے ہیں:

''(انشائیہ کو)۔۔۔۔ایسی فلسفیانہ شگفتگی کا حامل ہونا چاہیے جو پڑھنے والوں کے ذہن پر منطق اور استدلال کے ذریعہ نہیں بلکہ خوش گوار استعجاب اور بے ترتیب مفکرانہ انداز بیان کے ذریعے اپنا تاثر قائم کرے۔'' ۲؎

انشائیہ کی بنیادی صفات اور اسلوب کے ضمن میں ذکر کرتے ہوئے ڈاکٹر وحید عشرت کا خیال ہے کہ انشائیہ کی بنیادی خوبی انشا پردازی سے ہی نشو ونما پاتی ہے کیونکہ انشائیہ کی فطرت ایک مضمون کی ہے اور مضمون نگاری کی افزائش زبان کے بہتر استعمال سے ہوئی ہے۔ انشائیہ میں خیال آرائی بنیادی حیثیت رکھتی ہے یعنی انشائیہ نگار ایک خیال کو بیان کرتے ہوئے ضمناً بہت ساری باتوں کو بھی بیان کرتا چلا جاتا ہے جس کہ وجہ سے انشائیہ میں مختلف النوع خیالات کی شمولیت ہوتی ہے اور یہ خیالات انشائیہ نگار کے ظاہری اور باطنی مشاہدات و تجربات پر مبنی ہوتے ہیں اور ان خیالات کو بیان کرنے کے لئے ہلکے پھلکے، غیر رسمی، شگفتہ تحریر کا سہارا لینا ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

''انشائیہ متنوع خیالات سے مرصع ہوتا ہے۔ انشائیہ کا تخلیق عنصر تخلیق کار کے وجودی اور وہبی تجربے اور مشاہدے سے وابستہ ہوتا ہے۔ جتنا گہرا یہ باطنی تجربہ ہوگا اتنا ہی تخلیقی طور پر انشائیہ مرصع ہوگا۔ تحریر کی شگفتگی اور تلازمہ خیال انشائیہ کے اندر حسن اور نکھار پیدا کرتے ہیں ان کے بغیر انشائیہ اپنا تشخص منوا نہیں سکتا۔'' ۳؎

۱؎ ڈاکٹر سلیم اختر، انشائیہ کی بنیاد، عفیف پرنٹرس، دہلی، ۲۰۱۴ء، ص ۲۴۴

۲؎ اردو انشائیہ، بحوالہ ڈاکٹر سلیم اختر، انشائیہ کی بنیاد، عفیف پرنٹرس، دہلی، ۲۰۱۴ء، ص ۱۸۹۔۱۹۰

۳؎ وحید عشرت، بحوالہ ڈاکٹر سلیم اختر، انشائیہ کی بنیاد، عفیف پرنٹرس، دہلی، ۲۰۱۴ء، ص ۳۸۱

مذکورہ بالا اقتباس سے یہ واضح ہے کہ انشائیہ نگار کے تجربات و مشاہدات کی گہرائی ہی انشائیہ کو بہتر بنا سکتی ہے۔ساتھ ہی ساتھ اسلوب کی شگفتگی بھی انشائیہ کے معیار کو بلند کرنے اور پرکشش بنانے میں حد درجہ اہمیت رکھتی ہے۔

انشائیہ کے اسلوب میں تحریر کی شگفتگی کی اہمیت کو بیان کرتے ہوئے وزیر آغا غالب کے خطوط کا حوالہ دیتے ہوئے یوں لکھتے ہیں کہ:

''اردو ادب میں انشائیہ ایک نامیاتی کل کی حیثیت سے تازہ تازہ نمودار ہوا ہے گو اس کے اجزا کسی نہ کسی صورت میں جابجا بکھرے ہوئے ضرور نظر آتے ہیں۔ مثال کے طور پر مرزا غالب کے خطوط میں اسلوب کی شگفتی اور ذات کو عریاں کرنے کے اس روش کا بار بار احساس ہوتا ہے جو ایک انشائیہ کے لیے از بس ضروری ہے۔'' ۱

انشائیہ نگار کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ پختہ ذہن کا مالک ہو اسکے خیالات وسیع ہوں اور اسے تمام علوم پر دسترس حاصل ہو۔ نیاز فتح پوری انشائیہ نگار کے لئے زبان و بیان کی خوبیوں کے علاوہ شاعرانہ تخیل،حکیمانہ نکتہ رسی اور شعور ناقدانہ کے علاوہ فلسفیانہ انداز تفکر کو ضروی خیال کیا ہے۔چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

''اس فن لطیف کا تعلق صرف سلاست زبان سے نہیں بلکہ تخیل شاعرانہ اور شعور ناقدانہ بھی ہے اور حکیمانہ نکتہ رسی بھی ہے،اس کے لئے نہ صرف اعلی درجے کی شرف درکار ہے جو صرف وسیع مطالعے اور دقیق مشاہدے سے ہی حاصل ہو سکتی ہے۔ بلکہ فلسفیانہ انداز تفکر، جدت و اختراع یعنی ORIGINAL THINKING بھی ضروری ہے جو ایک فطین و ذہین دماغ، متوازن و سلیم طبیعت اور ایک کشادہ پاکیزہ قلب ہی کو میسر آتی ہے ان خوبیوں کے ساتھ ساتھ سادہ زبان اور شگفتہ و دلنشین انداز بیان۔'' ۲

مذکورہ بالا اقتباس میں ناقد نے انشائیہ میں شاعرانہ خیال اور تنقیدی شعور کی اہمیت کو اجاگر کیا ہے

۱۔ وزیر آغا، انشائیہ کے خدوخال، لبرٹی آرٹس پریس، دہلی، ۱۹۹۱ء، ص ۲۰

۲۔ مقامات ناصری، بحوالہ ڈاکٹر سلیم اختر، انشائیہ کی بنیاد، عفیف پرنٹرس، دہلی، ۲۰۱۴ء، ص ۱۷۶۔۱۷۷

اور یہ خصوصیات انشائیہ نگار اسی وقت اختیار کرنے میں کامیاب ہوگا جب اس کو مختلف النوع موضوعات پر قدرت حاصل ہو، اس کا مطالعہ گہرا ہو اور اطراف و اکناف کے ماحول پر گہری نظر ہو۔ اس کے ساتھ ساتھ انشائیہ میں اسلوب غیر رسمی انداز اور شگفتہ انداز بیان کا ہونا ضروری ہے

اسلوب کی شگفتگی کے تصور کی وضاحت کرتے ہوئے وزیر آغا نے اس سے متعلق غلط فہمیوں کو دور کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس سلسلے میں ان کی رائے یوں ہے:

> ''انشائی اسلوب کے سلسلے میں عام طور پر ''شگفتگی'' کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ مگر بدقسمتی سے اس لفظ نے زیادہ تر غلط فہمیاں ہی پیدا کی ہیں وجہ یہ کہ ایک عام قاری کے ذہن میں بات پختہ ہو چکی ہے ہنسی، تبسم اور شگفتگی ایک ہی کیفیت کے مختلف نام ہیں۔ لہذا اسے جب یہ بتایا جاتا ہے کہ انشائیہ سے شگفتگی اور مزاحیہ طنزیہ سے ہنسی یا تبسم پیدا ہوتا ہے تو وہ قدرتی طور پر ان سب کو ایک ہی ادب مقصود کر لیتا ہے۔ اس غلط فہمی کے پیش نظر یہ ضروری ہے کہ انشائی اسلوب کے لیے ''شگفتگی'' کے بجائے ''تازگی'' کا لفظ استعمال کیا جائے بلکہ اگر تخلیقی تازگی کہا جائے تو بہتر ہے اس فیصلے کی دو وجوہ ہیں۔ ایک تو یہ کہ انشائیہ کا اسلوب مجموعی طور پر تخلیقی سطح کا مظاہرہ کرتا ہے جب کی مزاحیہ اور طنزیہ اسلوب مضحکہ خیز موازنہ پر انحصار کرتے ہوئے بالعموم غیر تخلیقی سطح پر سرگرم رہتا ہے اور جہاں تضمین اور تصرف کو بروئے کار لاتا ہے، وہاں بھی اس کا مقصد تضاد مماثلت کی جگہ مضحکہ خیزی کو اجاگر کرنا ہوتا ہے جو ظاہر ہے کہ تخلیقی سطح کا وصف نہیں ہے۔'' [1]

مذکورہ اقتباس میں نقاد نے ''شگفتگی'' کے بجائے ''تازگی'' لفظ کے استعمال پر زور دیا ہے کیونکہ ''شگفتگی'' لفظ قاری کے ذہن میں بہت ساری غلط فہمیوں کو پیدا کرتا ہے۔ جس کی بنا پر قاری شگفتہ اسلوب اور مزاحیہ اسلوب کے درمیان فرق کرنے سے قاصر رہ جاتا ہے۔ شگفتہ اسلوب کو اختیار کرنے کے لیے انشائیہ نگار کو ہلکے پھلکے، غیر رسمی انداز اور آزادانہ خیال کی ضرورت ہوتی ہے جس میں انشائیہ نگار اپنی ذہانت

---

[1] وزیر آغا، انشائیہ کے خدوخال، لبرٹی آرٹس پریس، دہلی، ۱۹۹۱ء، ص ۳۱-۳۲

کا مظاہرہ کرتا ہے اور شاید اسی وجہ سے اس فن کو ایک مشکل عمل مانا جاتا ہے۔ انشائیہ کی کامیابی کی بنیاد بھی اسی شگفتہ اسلوب یعنی انشائیہ کی تازگی پر منحصر ہوتی ہے۔ اس سلسلے میں ایک اور اقتباس ملاحظہ ہو جس میں وزیر آغا نے انشائیہ کے اسلوب کی تازگی کے ضمن میں یوں وضاحت کی ہے:

> ''انشائیہ ہی ایک ایسی صنف ادب ہے جس میں نہ صرف تازگی کا سب سے زیادہ مظاہرہ ہوتا ہے بلکہ جس کی ذرا سی کمی بھی انشائیہ کو اس کے فنی مقام سے نیچے گرا دیتی ہے۔ تازگی سے مراد محض اظہار و ابلاغ کی تازگی نہیں۔ کیونکہ یہ چیز تو بہرحال انشائیہ میں موجود ہونی چاہیے۔ تازگی سے مراد موضوع اور نقطہ نظر کا وہ انوکھا پن ہے جو ناظر کی زندگی کی یکسانیت اور ٹھہراؤ سے اوپر اٹھ کر ماحول کا ازسرنو جائزہ لینے پر مائل کرتا ہے۔'' [1]

مذکورہ اقتباس سے یہ بات ظاہر ہے کہ انشائیہ کے اسلوب میں تازگی کا ہونا لازمی ہے اور یہ تازگی انشائیہ نگار اپنی شخصیت کو اجاگر کرنے کے لیے انوکھے اور نرالے انداز میں بیان کرتا ہے یعنی وہ چھوٹی سے چھوٹی اور معمولی چیزوں کو بھی نئے زاویے سے دیکھنے کی کوشش کرتا ہے تاکہ قاری کا ذہن بھی چیزوں کو نئے زاویے سے دیکھنے پر آمادہ ہو جائے۔

انشائیہ کا اسلوب اور تازگی فکر اس لیے اہمیت رکھتی ہے کہ انشائیہ مختلف عناصر کے متوازن حسن کی بدولت وجود میں آتا ہے اور بعض اوقات کسی ایک عنصر کی خامی کی وجہ سے انشائیہ ناکامی کا شکار ہو جاتا ہے۔ آزادانہ فکر اور زندگی کے مختلف پہلوؤں کو نئے زاویے سے دیکھنا انشائیہ کی صفات میں شامل ہیں۔ انشائیہ کی تازگی فکر اور اس کے انوکھے انداز بیان کے ضمن میں ڈاکٹر سلیم اختر نے اپنی رائے یوں رکھی ہے:

> ''انشائیہ نگاری کے ضمن میں اس بات پر زور بہت زور دیا جاتا ہے کہ انشائیہ نگار نگاہ کے انوکھے زاویے سے غیر اہم چیزوں کو اہم بنا کر پیش کر سکتا ہے اور تازگی فکر سے ان میں وہ معنویت پیدا کر دیتا ہے جس کی طرف اس سے پہلے کسی کا

[1] وزیر آغا، انشائیہ کے خدوخال، لبرٹی آرٹس پریس، دہلی، ۱۹۹۱ء، ص ۱۲۔۱۳

دھیان نہ گیا تھا اور اسی ندرت سے انشائیہ میں حظ پیدا ہوتا ہے۔'' ۱؎

دراصل انشائیہ نگار اس صنف میں اپنی شخصیت کو اجاگر کرنے کے لئے اپنے اطراف واکناف میں موجود افراد، اشیاء اور زندگی کے حادثات کو ایک نئے زاویے سے دیکھنے کی کوشش کرتا ہے اور چیزوں کو روایتی طرز سے ہٹ کر نئے زاویے سے دیکھنے کا یہی انداز انشائیہ میں تازگی پیدا کرتا ہے جس کی بدولت قاری کو ایک چونکا دینے والا زاویہ مل جاتا ہے اور قاری یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ اس نے پہلے اس پہلو کو کیوں نہیں سوچا۔ یہی چونکا دینے والا فن انشائیہ کی تازگی کی ضمانت ہے اور یہی لطیف انداز قاری کے لطف اندوز ہونے کا وسیلہ بنتا ہے جس کو کافی اہمیت دی جاتی ہے۔

انشائیہ کے اسلوب کی شگفتگی اور لطافت کا ذکر کرتے ہوئے ڈاکٹر سلیم اختر ایک جگہ اور یوں رقم طراز ہیں:

> ''عورت مرد کی حسیات اور احساسات سے اپیل کرتی ہے اس لیے وہ ہمیشہ EMOTIONAL زبان میں گفتگو کرتی ہے تو انشائیہ نگار بھی نسوانی انداز اپنا کر بات بناتا ہے۔ اس ضمن میں بات کرنے اور بات بنانے میں جو لطیف فرق ہے اسے ضرور ملحوظ رکھا جائے۔ اب بات بنانے میں جو انداز دلربائی ملتا ہے اسے انشائیہ کے اسلوب کی لطافت اور اظہار کی کوملتا کا نام بھی دیا جاسکتا ہے۔ ۲؎

انشائیہ نگار اپنے انشائیہ میں لطیف نکتہ پیدا کرنے کے لیے بات سے بات پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے اور اس عمل میں وہ زندگی کے مختلف پہلوؤں کا احاطہ کرتا جاتا ہے۔ یہ تمام چیزیں استدلال کی مدد کے بغیر ہوتی ہیں یعنی کی انشائیہ نگار استدلال کا سہارا لیتا ہے تو وہ لطیف اسلوب پیدا کرنے سے قاصر رہے گا۔

انشائیہ نگار کا مقصد قاری کو معلومات فراہم کرانا نہیں بلکہ شگفتہ اسلوب اور لطیف نکتہ پیدا کرتے

۱؎ ڈاکٹر سلیم اختر، انشائیہ کی بنیاد، عفیف پرنٹرس، دہلی، ۲۰۱۴ء، ص ۱۳۳

۲؎ ڈاکٹر سلیم اختر، انشائیہ کی بنیاد، عفیف پرنٹرس، دہلی، ۲۰۱۴ء، ص ۲۱۶۔۲۱۷

ہوئے چیزوں کو نئے زاویے سے دیکھنا ہے جو قاری کے لیے لطف و مسرت کا باعث بن سکے۔اس سلسلے میں وزیر آغا نے اپنی رائے یوں رکھی ہے:

''ایک اچھا انشائیہ پڑھنے کے دوران میں آپ شاید حظ، مزاح،طنز تعجب، اکتساب علم اور تخیل کی سبک روی ایسے بہت سے مراحل سے روشناس ہوں لیکن انشائیہ کے خاتمہ پر آپ کو محسوس ہوگا کہ آپ نے زندگی کے کسی مخفی گوشے روشنی کا ایک نیا پرتو دیکھا ہے اور آپ زندگی کی عام سطح سے اوپر اٹھ آئے ہیں۔کشادگی اور رفعت کا یہ احساس ایک ایسا متاع گراں بہا ہے جو نہ صرف آپ کو مسرت بہم پہنچاتا ہے بلکہ آپ کی شخصیت میں بھی کشادگی اور رفعت پیدا کر دیتا ہے۔'' [۱]

انشائیہ میں اسلوب کی شگفتگی،مسرت اور نشاط آفرینی کے استعمال سے ہی قاری کو مسرت پہنچائی جاتی ہے۔اس ضمن میں ڈاکٹر سلیم اختر نے اپنی رائے یوں رکھی ہے:

''شگفتگی،مسرت،بہجت،نشاط آفرینی جیسے الفاظ سے انشائیہ کی جس خوبی کو واضح کیا جاتا ہے وہ بھی دراصل قاری ہی کیلئے ہوتی ہے۔انشائیہ نگار یا کوئی بھی تخلیق کار ادب پارہ کی تکمیل پر جو مسرت محسوس کرتا ہے وہ اس لحاظ سے ذاتی رہتی ہے کہ قارئین تک اس کا ابلاغ ممکن نہیں لہذا اسے تخلیق کار کا انعام سمجھنا چاہیے لیکن قاری جو مسرت حاصل کرتا ہے وہ خیال اور اسلوب کی فنکارانہ آمیزش سے جنم لینے والے جمالیاتی تجربہ سے مشروط ہوتی ہے۔خیال جتنا بلند ہوگا اور اسلوب جتنا مکمل ہوگا تخلیق بھی اتنی ہی ارفع ہوگی اور اس لحاظ سے حاصل کردہ مسرت بھی اتنی ہی لطیف ہوگی۔'' [۲]

اسی سلسلے میں ڈاکٹر سلیم اختر مزید یوں رقم طراز ہیں:

''انشائیہ نگار اپنے قاری کو یہ مسرت دو طریقوں سے بہم پہنچاتا ہے ایک تو نئے انوکھے اور چونکا دینے والے خیالات سے اور دوسرے اسلوب کی پرکاری سے

۱۔ وزیر آغا،انشائیہ کے خدوخال،لبرٹی آرٹس پریس،دہلی،۱۹۹۱ء،۱۰۔۱۱

۲۔ ڈاکٹر سلیم اختر،انشائیہ کی بنیاد،عفیف پرنٹرس،دہلی،۲۰۱۴ء،ص ۳۰۹

ہے۔واضح رہے کہ اگر وہ فنکارانہ امتزاج سے خیال اور اسلوب کو شیر وشکر کرنے
میں ناکام رہتا ہے تو پھر خیال اور اسلوب کی دوئی سے انشائیہ بھی غزل کے شعر کی
مانند دولخت ہو کر خوش ذوق قاری کو بدمزہ کرے گا۔''[1]

مذکورہ تمام اقتسابات کے حوالے سے یہ بات واضح ہے کہ انشائیہ نگار کا مقصد صرف اور صرف قاری کو لطف ومسرت پہنچانا ہے اور اس کے لئے اس کو کسی بھی منطق اور دلائل کی ضرورت نہیں ہوتی ہے بلکہ وہ شگفتہ اسلوب اور لطیف نقطوں کے ذریعے اشیاء یا زندگی کے مشاہدات وتجربات کو نئے زاویے سے بیان کرنے کی کوشش کرتا ہے جس سے قاری چونک اٹھے اور اس کے اندر تازگی فکر پیدا ہو۔انشائیہ نگار اپنے اسی فن کی بدولت انشائیہ میں حظ اور لطف ومسرت پیدا کرتا ہے۔

زینت ساجدہ کے انشائیوں کے مطالعے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ انھوں نے اسلوب، حسن اور شگفتگی کا دامن نہیں چھوڑا۔ بلکہ اپنی تحریر میں سادہ اور عام فہم اسلوب اختیار کرتے ہوئے عام اور غیر سنجیدہ باتوں کو بڑے ہی انوکھے انداز میں قاری کے سامنے پیش کیا۔مثال کے طور پر ان کے ایک انشائیہ ''گنڈی پیٹ کا پانی'' سے ایک اقتباس ملاحظہ ہو جس میں انھوں نے گنڈی پیٹ کے پانی کی صفات کو بڑے ہی لطیف انداز میں بیان کیا ہے:

''لوگ کہتے ہیں حیدرآباد کی ہوا میں بڑی تاثیر ہے،نہیں صاحب یہ بات نہیں، یہ
اس گنڈی پیٹ کے پانی کا اثر ہے کہ اچھا خاصا چست چالاک، سادہ مزاج، اعلی
دماغ، شریف آدمی اس کے پیتے ہی خوشامد پسند، رشوت خور، سست خرام اور اقربا
نواز بن جاتا ہے تو ند نکل آتی ہے اور عقل پچک جاتی ہے۔''[2]

اسلوب کی لطافت اور شگفتگی سے پر ایک اور اقتباس انشائیہ ''چار مینار پر غلاف'' سے ملاحظہ ہو:

''دور دور سے لوگ باگ آئیں گے کہ تاریخی عمارت پر غلاف چڑھ رہا
ہے۔صندل، چراغاں اور عرس کا جیسا اہتمام ہوگا۔قوال، مسخرے، بھانڈ سب

---

[1] ڈاکٹر سلیم اختر، انشائیہ کی بنیاد، عفیف پرنٹرس، دہلی، ۲۰۱۴ء، ص ۳۱۲

[2] گنڈی پیٹ کا پانی، اسلوب بیان اور، اردو مجلس، حیدرآباد، ۲۰۰۹ء، ص ۵۶۔۵۷

آ ئیں گے اور سر کے بل آ ئیں گے۔اہل نظر آنکھ سینکیں گے اور اہل دل ''مگر نازم بہ ایں ذوقے کہ پیش یار می رقصم'' کی کیفیت طاری کر کے محفل کو گرمائیں گے۔شہر کے ہوٹل کھچا کھچ بھر جائیں گے۔پان ، بیڑی ،سگریٹ سے لے کر کفن دفن والوں تک کا فائدہ ہوگا۔تجارت چمک جائیں گی ،لوگ کھائیں گے بیمار پڑیں گے، حادثوں اور بدہضمی سے مریں گے، زندگی سے موت تک کا بازار گرم ہو جائے گا۔واہ بھئی واہ داد دیجئے ہمارے دماغ کی ایک پیسہ ٹیکس اور فائدہ ہی فائدہ۔'' ۱؎

انشائیہ ''بی جمالو'' بھی اسلوب کی لطافت اور شگفتگی سے مزاحیہ نظر آتا ہے۔اس انشائیہ کے مطالعہ سے قاری کو فلسفیانہ شگفتگی کا احساس ہوتا ہے۔مثال کے طور پر ایک اقتباس پیش ہے جس میں انشائیہ نگار نے ایک خیالی کردار بی جمالو کو بڑے ہی لطیف اور شگفتہ انداز میں پیش کیا ہے:

''انگریزوں اور فرانسیسیوں کی طاقت آزمائی میں انہیں کی حکمت عملی فیصلہ کن ثابت ہوئی۔انہیں کی وجہ سے غدر برپا ہوا۔روم وشام وچین و ماچین کی سیاحت سند باد سے زیادہ انہوں نے کی تھی۔ابن بطوطہ کا سفر نامہ دراصل انہیں کا لکھا ہوا ہے۔چرچل نے انہیں کے آگے زانوئے ادب تہہ کیا تھا۔یہ نپولین کی انا اور ہٹلر کی آیارہ چکی تھیں۔میر جعفر ان کا منہ بولا بیٹا تھا۔مقبرہ انکا اورنگ آباد میں ہے ملک پیٹ کی قدیم مسجد اور وارنگل کا مشہور مندر انہیں کا بنوایا ہوا ہے۔اورنگزیب قلعہ گولکنڈہ میں انہیں کی رہنمائی کی وجہ سے داخل ہوسکا تھا۔ہیموں بقال اور لودھی نے انہیں کے ہاتھوں شکست کی ذلت اٹھائی۔شیر شاہ سوری کے بستر مرگ پر یٰسین پڑھنے کی سعادت انہیں کو نصیب ہوئی۔قطب شاہ کی لاٹ کی دو منزلیں انہیں کے بوجھ سے گر پڑیں۔۔۔۔۔۔آپ جو چاہے لکھیں، سچ ثابت ہو جائے گا۔'' ۲؎

۱؎ چار مینار پر غلاف، اسلوب بیان اور، اردو مجلس، حیدر آباد، ۲۰۰۹ء، ص ۶۰۔۶۱

۲؎ بی جمالو، اسلوب بیان اور، اردو مجلس، حیدر آباد، ۲۰۰۹ء، ص ۳۳۔۳۴

مذکورہ اقتباس میں انشائیہ نگار نے خیالی کردار بی جمالو کے ذریعے اپنے سماجی مشاہدات کو قاری کے سامنے پیش کیا ہے۔ انہوں نے اس میں یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ ہر سماج میں کچھ ایسے لوگ ہوتے ہیں جنہیں سارے جہان کی خبر ہوتی ہے اور وہ اپنے فن سے لوگوں کو متاثر کرتے ہوئے رشتوں کو توڑنے کا کام بھی بڑے ہی شاطرانہ انداز میں کرتے ہیں۔ ان کی شاطرانہ سرگرمیوں کو انشائیہ نگار نے بڑے ہی شگفتہ اور لطیف انداز میں بیان کیا ہے۔

زینت ساجدہ کے دیگر انشائیوں کے اسلوب میں بھی شگفتگی اور لطافت نظر آتی ہے جس کے ذریعے وہ اپنی شخصیت کو اجاگر کرتی ہیں۔ انہوں نے ہلکی پھلکی زبان، شگفتہ اور دلنشین انداز بیان اپناتے ہوئے اپنے تجربات و مشاہدات کو پیش کیا ہے جس سے انشائیہ میں لطف پیدا ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں چند مثالیں پیش ہیں:

> ''آدم ٹھہرے سادہ لوح، جھٹ بی حوّا کی فرمائش کر بیٹھے۔ حوّا کو سکھایا پڑھایا تو وہ آدم کی جان کو آ گئیں، آخر گندم کیوں نہ کھائیں۔ کوئی نہ کوئی لذّت تو ہوگی۔ چلیئے جنت سے نکالے گئے وہاں چھٹی ہوئی لیکن ابن آدم کی ان کے بغیر کیسے بسر ہوتی؟ انھیں کے دم سے تو قصّہ آدم کو رنگین ہونا تھا۔ ابھی تک بھگت رہے ہیں اور لاحول پڑھ رہے ہیں۔'' ۱

> ''ان دنوں بھی مصروفیت میں کمی نہیں آئی اور نہ مقبولیت میں فرق آیا۔ کبھی چین سرحد پر چہل قدمی کر رہی ہیں کبھی یورپ پہنچ کر ایشیائی ملکوں کی تنگدستی اور پسماندگی کی وکالت کر رہی ہیں۔ کبھی تیل کے چشموں اور ہائیڈروجن اور ایٹم بموں کی نگرانی کر رہی ہیں، کبھی فرد کی آزادی کی حمایت میں آواز بلند کر رہی ہیں۔ بھلا ان جیسا بے باک اور حق گو کب ہوا ہے۔'' ۲

> ''ساریاں ہوں کہ جوتیاں، چوڑیاں ہوں کہ جوتیاں، سب پر مشق ستم جاری ہے کبھی تو ان اداؤں سے لیس دلبر، سچ مچ قاتل اور ہوش ربا نظر آتے ہیں، مگر کبھی

۱۔ بی جمالو، اسلوب بیان اور، اردو مجلس، حیدرآباد، ۲۰۰۹ء، ص ۳۹

۲۔ بی جمالو، اسلوب بیان اور، اردو مجلس، حیدرآباد، ۲۰۰۹ء، ص ۴۰

کبھی ایسے نمونے دکھائی دیتے ہیں کہ بے ہوش ہونے کو جی چاہتا ہے۔'' [1]

مذکورہ اقتباسات میں انشائیہ نگار نے اپنے مشاہدات و تجربات کو ایک نئے زاویے سے پیش کیا جس کو پڑھ کر قاری کے سامنے نئے پہلو رونما ہوتے ہیں اور یہی انشائیہ کی تازگی اور شگفتگی کی ضمانت ہے۔

جیسا کہ انشائیہ کے اسلوب کے بارے میں یہ رائج ہے کہ انشائیہ کی کامیابی اس کی تازگی اور شگفتہ اسلوب پر منحصر ہے۔ زینت ساجدہ کے انشائیوں میں بھی وہ تازگی اور انوکھا پن نظر آتا ہے جو قاری کو غور و فکر کا ایک نیا زاویہ فراہم کرتا ہے۔ عام اور معمولی باتوں کو بھی انہوں نے اس انوکھے انداز میں بیان کیا ہے کہ قاری کے اندر دلچسپی قائم رہتی ہے اور یہی انوکھا پن اور چیزوں کو نئے زاویے سے دیکھنے کا فن انشائیہ میں تازگی پیدا کرتا ہے۔ مثال کے طور پر انشائیہ ''رہیے اب ایسی جگہ چل کر'' کا ایک اقتباس پیش ہے:

''وہاں حمّام تک میں تنہائی نصیب نہ تھی اور یہاں دن رات گھر بالکل اپنا ہے، جو جی میں آئے کریں، آنگن میں لوٹنے لگائیں، سر کے بل قلابازیاں کھائیں، نہاتے وقت چلّا چلّا کر فلمی گیت گائیں دن بھر تولیہ لپیٹے پھرتے رہیں۔ میاں بیوی وقت بے وقت شیریں فرہاد اور لیلیٰ مجنوں کی ایکٹنگ میں مصروف رہیں، شام میں سڑکوں پر گھومنے نکلیں۔ کسی کی مجال ہے کہ آپ سے پوچھ لے کیا حال ہے۔'' [2]

مندرجہ بالا اقتباس میں زینت ساجدہ نے غیر معمولی اور عام باتوں کو بڑے ہیں انوکھے انداز میں پیش کیا ہے اور اپنے شخصی پہلوؤں کو بھی قاری کے سامنے بے نقاب کیا ہے۔ ان کے انشائیوں میں لطف اندوزی، مسرت اور نشاط آفرینی بجا طور پر نظر آتی ہیں۔ بات سے بات پیدا کرتے ہوئے زندگی کے مختلف پہلوؤں کو منکشف کرنا اور بڑی سادگی سے آگے بڑھ جانے کا فن انہیں خوب حاصل ہے۔ ان کے اسلوبِ بیان کے سلسلے میں مرزا ظفر الحسن نے ''اسلوب بیان اور'' کے پیش لفظ میں اپنی رائے یوں پیش کی ہے:

---

[1] دیکھا دیکھی، اسلوب بیان اور، اردو مجلس، حیدر آباد، ۲۰۰۹ء، ص ۷۷

[2] رہیے اب ایسی جگہ چل کر، اسلوب بیان اور، اردو مجلس، حیدر آباد، ۲۰۰۹ء، ص ۵۲

''صحیح زبان لکھ لینا کوئی کمال نہیں ہے۔کمال تو یہ ہے کہ قاری زبان کی وجہ سے بھی کسی تخلیق کے مطالعہ کی طرف مائل ہو۔اس لحاظ سے زینت ایک باکمال قلمکار ہیں۔صاف ستھری اور سادہ زبان اور اسی روانی اور شگفتگی کے ساتھ جس سے کہ وہ تقریر کرتی ہیں۔جملوں میں نہ آرائشی تراکیب اور نہ چربی چڑھے ہوئے موٹے موٹے الفاظ ملتے ہیں جن سے مفہوم خبط اور قاری خبطی ہوجاتا ہے۔''[1]

زینت ساجدہ کے انشائیہ اپنے بیان کی گفتگو میں بھی کامیاب نظر آتے ہیں۔ان کے انشائیے قاری کے دل ودماغ کو تازگی بخشنے والی اور تھکے ہوئے ذہنوں کو طاقت وتوانائی بخشنے والی ان کی تحریریں اپنی شگفتہ بیانی کے لئے جانی اور پہچانی جائیں گی۔ان کے انشائیوں کا ہر لفظ قاری کو ایک نیا اور لطیف احساس دلاتا ہے اور یہی ایک کامیاب انشائیہ کی پہچان ہے جو قاری کو تحریر کے اسلوب کی بدولت دلچسپی کو ضائع نہیں ہونے دیتا ہے بلکہ قاری کو فرحت ومسرت عطا کرتا ہے اور یہ خوبی زینت ساجدہ کے انشائیوں میں بدرجہ اتم موجود ہے۔

عدم تکمیل کا احساس

انشائیہ کی فنی صفات کا ذکر کرتے ہوئے ڈاکٹر سلیم اختر نے انشائیہ کی عدم تکمیل کے احساس کو بھی انشائیہ کے فن کا ایک اہم عنصر تسلیم کیا ہے۔انشائیہ نگار انشائیے کو ایسے مقام پر لے جاکر ختم کرتا ہے کہ قاری کو اس کے نامکمل ہونے کا احساس ہوتا ہے اور قاری غور وفکر کرنے پر آمادہ ہوجاتا ہے۔تکنیکی اعتبار سے ہم اس کو افسانے کے اچانک اختتام جیسا بھی قرار دے سکتے ہیں لیکن فرق یہ ہے کہ افسانے میں خاص فضا کے پس منظر میں توقعات ابھارنے کے بعد ان کے برعکس اختتام پر پہنچایا جاتا ہے جبکہ انشائیوں میں موضوع کے بارے میں پیدا ہونے والی توقعات فنی رعنائی سے باطل کردی جاتی ہے لیکن انشائیہ نگار غیر رسمی طریق کار اختیار کرتے ہوئے موضوع کے متعلق تصور کے بارے میں قاری کے ذہن کو غور وفکر کے لئے ایک نیا زاویہ پیش کرتا ہے۔

زینت ساجدہ کے انشائیوں میں بھی یہ صفت بجا طور پر نظر آتی ہے۔ان کے انشائیوں کے مطالعہ

[1] مرزا ظفر الحسن، پیش لفظ، اسلوب بیان اور، حیدرآباد، ۲۰۰۹ء ص ۸

کے بعد عدم تکمیل کا احساس ہوتا ہے اور انشائیہ کے اختتام پر قاری کو ایک نیا اور غیر رسمی سا زاویہ مل جاتا ہے جو اس کے ذہن کو غور و فکر کی طرف راغب کرتا ہے اور زندگی کے ان پوشیدہ حقائق کو اپنے اندر تیسری آنکھ یعنی بصیرت کی نظر سے دیکھنے لگتا ہے۔ مثال کے طور پر انشائیہ ''اگر اللہ میاں عورت ہوتے'' کا آخری اقتباس ملاحظہ ہو:

> ''مگر سن لے تو چاہے کوئی ہو، کچھ نہ ہو، سب کچھ ہو، پھر بھی مجھے پیارا ہے۔ میری بے نام آرزوؤں سے زیادہ پیارا۔ تو عالم الغیب ہے اس لئے جانتا ہے کہ گستاخی کیسی ہے تجھی سے تیری باتیں کرتے ہیں اس لئے معاف کر دینا اللہ میاں میں نے تو یونہی سوچا تھا اگر اللہ میاں عورت ہوتے تو۔۔۔'' [1]

اس انشائیہ میں انشائیہ نگار نے خدا کی جنسی صفت پر ایک بحث چھیڑی اور مختلف عقلی دلائل کے ذریعہ خدا کو ایک مخصوص جنس کی طرف منسوب کیا لیکن انشائیہ کے اختتام پر وہ تمام تر دلائل کو ترک کرتے ہوئے خدا کے سامنے سرِ خم تسلیم کر دیا اور خدا کی اس جنسی صفت کو بیان کرنے سے پرہیز کیا۔ اس نامکمل نکتہ سے قاری کو ایک نیا اور انوکھا سا زاویہ مل جاتا ہے جس سے قاری کا ذہن آگے سوچنے اور غور و فکر کرنے پر آمادہ ہوتا ہے۔

اسی طرح انشائیہ ''میں نے نوکری کی'' کا آخری اقتباس پیش ہے جو قاری کو اپنے نامکمل ہونے کا احساس دلاتا ہے:

> ''ذہنی رفعت مقصود تھی تو کسی کے لکھے ہوئے مضامین میں اپنے نام چھپواتے اور اپنی سرپرستی میں اخبار نکالتے۔ دینداری اور ثواب کمانا تھا تو محلے کی لڑکیوں کے رشتے ناطے طے کرتے۔ وقت گزاری کا مسئلہ تھا تو پرانے کپڑے ادھیڑ کر سیتے، اس میں جی نہ لگتا تو پرانا نسخہ تو کہیں گیا نہیں تھا۔ پڑوسن کو آواز دے کر غیبت کرتے، چیڑے چنتے، اسکینڈل پھیلاتے یا جھگڑا کھڑا کر کے وقت گزارتے مزا آتا۔ پر شامت جو آئی تھی۔۔۔۔۔'' [2]

---

[1] اگر اللہ میاں عورت ہوتے، اسلوب بیان اور، اردو مجلس، حیدر آباد، ۲۰۰۹ء، ص ۲۵

[2] میں نے نوکری کی، اسلوب بیان اور، اردو مجلس، حیدر آباد، ۲۰۰۹ء، ص ۸۴

مذکورہ بالا اقتباس میں انشائیہ نگار نے نوکری کے حوالے سے اپنی شخصیت کے ظہور کے لئے زندگی کے مختلف تجربات اور مشاہدات کو بیان کیا ہے جو ایک زیر ملازمت فرد کی زندگی میں رونما ہوتے ہیں۔اس انشائیہ میں ملازمت کے دوران پیش آنے والے مسائل اور مشکلات کا ذکر موجود ہے اور اختتام میں کچھ ایسی سرگرمیوں کا بھی ذکر ملتا ہے جس کو فرد نوکری نہ کرنے کی صورت میں عمل میں لاسکتا ہے۔ یہ انشائیہ بھی قاری کو عدم تکمیل کا احساس دلاتا ہے جیسا کہ مذکورہ بالا اقتباس پڑھنے سے واضح ہے۔انشائیہ کی یہ عدم تکمیلیت قاری کے ذہن کو اس موضوع کے متعلق تمام تصورات کی طرف راغب کرتی ہے اور یہ انشائیہ کا ایک خاص وصف ہے۔

زینت ساجدہ کا ایک بہترین انشائیہ ''کباڑ خانے سے میوزیم تک'' کا اختتامیہ حصہ ملاحظہ ہو:

> ''وہ فلمی ایکٹر جو نانی سے نواسی تک کے ساتھ ہیرو کا رول ادا کر چکے ہیں، وہ ہیروئن جو کئی بار نانی بن چکی ہیں، وہ سوشل ورکر خواتین جن کے کارنامے صرف باتصویر رسالوں میں محفوظ ہیں، وہ سیاستدان جنہوں نے جھونپڑی سے لے کر سوئیزرلینڈ تک کا سفر ایک ہی جنم میں طے کیا ہے، وہ پروفیسر جو اپنے مضمون کے علاوہ سارے مضامین میں ماہر ہوں، وہ انجینئر جن کے بنائے ہوئے ڈیم ہر سال بہہ جاتے ہیں تاکہ ملک مسلسل تعمیر نو رہے۔وہ ڈاکٹر جن کے نام سے قبرستان آباد ہیں۔ان سب کی باقاعدہ فہرست مرتب کرنی ہوگی۔ ہمارا ملک ایک عظیم ملک ہے اس لئے کام بھی بڑے اور قومی پیمانے پر ہوا ہوگا یہاں نوادرات بھی لاکھوں، نادرالوجود بھی لاکھوں۔دیکھئے اس میوزیم کی تعمیر کب ہوگی۔ ہمارا منصوبہ تو تیار ہے لیکن سرکاری منصوبہ رخصت پر ہے اور میٹھی نیند سو رہا۔'' [1]

اس انشائیہ میں انشائیہ نگار نے اپنی شخصیت کے پہلوؤں کو بے نقاب کیا ہے اور کباڑ خانے سے لے کر میوزیم تک کے پیشے کا انتخاب کرنے کی خیالی منصوبہ بندی کی ہے۔انشائیہ نگار نے بات سے بات پیدا کرتے ہوئے انشائیہ کا اختتام اس انداز میں کیا ہے کہ قاری کو غور وفکر کا ایک نیا پہلو مل جاتا ہے۔

---

[1] کباڑ خانے سے میوزیم تک، اسلوب بیان اور، اردو مجلس، حیدر آباد، ۲۰۰۹ء، ص ۹۵۔۹۶

اس سلسلے میں زینت ساجدہ کا ایک اور انشائیہ ''میری مرغیاں'' کا آخری حصہ پیش ہے:

''شرم نہیں آتی۔مگر میں کہتی ہوں بکنے دو انہیں۔اچھا ہوا ان لوگوں کو کھلا دیا ورنہ زہر ہو جاتیں اور یوں بھی گھر کی بلا جانور پر ٹلتی ہے، بار بار دل کو سمجھاتی ہوں۔۔۔سمجھتے سمجھتے سمجھ جائے گا۔اور لو یاد ہی نہ رہا، کل منگل ہے اور اگر دو مرغیاں اور منگوالوں تو۔۔۔'' [1]

یہ انشائیہ بھی اپنے نامکمل ہونے کا ثبوت پیش کرتا ہے اور اختتامیہ جملے سے قاری کو غور وفکر کا ایک نیا زاویہ ملتا ہے۔انشائیہ کے عدم تکمیل کے سلسلے میں زینت ساجدہ کے ایک اور انشائیہ ''گنڈی پیٹ کا پانی'' کا آخری اقتباس بطور مثال پیش ہے:

''اگر لٹانے کا حوصلہ آپ میں باقی نہیں رہا تو انجمن تاجران کے سامنے یہ مسئلہ رکھیے کہ یہ پانی دساور بھیجا جائے اور دوسرے صوبوں کے لئے کوٹا مقرر کر دیا جائے تاکہ اس کے پینے کے شوق میں لوگ یہاں تک آنے کی تکلیف نہ کریں اور گھر بیٹھے انہیں غیر ملکی پیٹرول کی طرح گنڈی پیٹ کا پانی مل جائے ورنہ ڈر ہے کہ ہمارے لئے گنڈی پیٹ کا پانی تک نہ بچے۔'' [2]

زینت ساجدہ کے دیگر انشائیے جیسے بی جمالو، مکان بنا ڈالا، چار مینار پر غلاف، دیکھا دیکھی، چلی گئی گرمی جب بیلا پھولے آدھی رات، کاہ کرو سنگھار پیا مورا اندھا میں بھی خاتمہ پر عدم تکمیل کا احساس ہوتا ہے۔لیکن کچھ انشائیوں میں زینت ساجدہ اس فن کو اپنانے میں ناکام بھی نظر آتی ہیں۔مثال کے طور پر انشائیہ ہم ہیں تو ابھی راہ میں ہیں سنگِ گراں اور، رہیے اب ایسی جگہ چل کر، خالہ ماں سلام، اگر میں مرد ہوتی، وغیرہ انشائیے اپنے آپ میں مکمل نظر آتے ہیں جس کی وجہ سے انشائیہ کے اختتام پر قاری کو غور وفکر کا نیا زاویہ نہیں مل پاتا ہے۔

---

[1] میری مرغیاں، اسلوب بیان اور، اردو مجلس، حیدر آباد، ۲۰۰۹ء، ص ۱۱۱

[2] گنڈی پیٹ کا پانی، اسلوب بیان اور، اردو مجلس، حیدر آباد، ۲۰۰۹ء، ص ۵۷

انکشاف ذات اور شخصی نقطہ نظر

انشائیہ میں انکشاف ذات اور شخصی نقطہ نظر کو خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ اظہار ذات کا رجحان مغربی انشائیہ نگاروں کی تخلیقات میں حددرجہ موجود ہے اور انہیں امتیازی طور پر Personal Essay کے نام سے بھی موسوم کیا گیا۔ انکشاف ذات اور شخصی نقطہ نظر کو انشائیہ کے بنیادی اجزاء میں شمار کیا جاتا ہے۔ جب ہم انشائیہ نگاری کو بحیثیت ایک صنف مطالعے میں لاتے ہیں تو یہ بات واضح ہوتی ہے کہ انکشاف ذات ایک ایسا سرچشمہ ہے جس سے انشائیہ کے دیگر اجزاء کی گہری وابستگی ہے خاص طور پر شخصی نقطہ نظر جو انشائیہ میں اس قدر اہمیت کا حامل ہے جتنا انکشاف ذات بلکہ ذاتی یا انفرادی تاثرات کی شمولیت کے بغیر بے معنیٰ نظر آئے گا، اور شخصی نقطہ نظر ان کے ساتھ ذات ہی کا ایک جز تو ہے۔

انشائیہ میں انکشاف ذات سے مراد یہ نہیں کہ یہ پیرایہ بہ اظہار فرد ذاتی زندگی کے معاملات سے ہی تعلق رکھتا ہے بلکہ انشائیہ میں اپنی ذات کے حوالے سے زندگی کے جز و یا کل سے متعلق منفرد نقطہ نظر پیش کرتا ہے۔ ایک عام نظر جو کسی بھی چیز کو گھسے پٹے طریقے سے دیکھنے کی عادی ہوگئی ہے، اس سے قطع نظر نئے زاویے سے چیزوں کو دیکھنے میں ہی انشائیہ کا فن پوشیدہ ہے۔ خودنوشت سوانح سے یہ صنف اس لیے بھی ایک ممتاز حیثیت رکھتی ہے کیوں کہ سوانح عمری ذات کے جس گھیرے میں محدود ہو کر سمٹ جاتی ہے، انشائیہ اس سے ایک قدم بڑھ کر ایک امکانی سوچ وفکر پیدا کرتا ہے اور انوکھے انداز بیان اور منفرد نقطہ نظر کے اظہار سے اس کی وسعت میں اضافہ ہوتا ہے۔

گویا انشائیہ میں موضوع کی بہ نسبت انشائیہ نگار کی ذات توجہ کا مرکز ہے۔ اس بات کو مزید واضح کرتے ہوئے ڈاکٹر وزیر آغا نے انشائیہ نگار کے طریقہ کار کو اس طرح بیان کیا ہے:

> ''انشائیہ کا خالق نہ صرف رسمی طریق کار کی بجائے ایک غیر رسمی طریق کار اختیار کرتا ہے، بلکہ غیر رسمی موضوعات پر نقد وتبصرے سے کام لینے کے بجائے اپنی روح کے کسی گوشے کو بے نقاب اور اپنے شخصی ردّعمل کے کسی پہلو کو اجاگر کرتا ہے۔'' [1]

---

[1] وزیر آغا، انشائیہ کے خدوخال، لبرٹی آرٹس پریس، دہلی، ۱۹۹۱ء، ص ۱۰

وزیر آغا کی بہ نسبت مشکور حسین شخصی ردعمل کے اظہار کو ایک وسیع تناظر میں دیکھتے ہیں ان کے نزدیک مشاہدہ ذات کے ذریعے مشاہدہ کائنات کیا جا سکتا ہے اور انکشاف ذات اصل میں کائنات کو نئے طریقے سے سمجھنے کی ہی ایک کوشش ہے۔ اس سلسلے میں ان کا اظہار خیال یوں ہے:

''کائنات کا انوکھا پن بھی آپ کو اسی وقت محسوس و معلوم ہوگا جب کہ آپ نے اپنی ذات کے انوکھے پن کو تلاش کر لیا ہوگا۔ اپنی طرف دیکھنے کا عمل کائنات کی طرف دیکھنے کے بے شمار باب وا کرتا ہے۔ مشاہدہ ذات تو کائنات کے اسرار معلوم کرنے کی بڑی چابی ہے۔ کلید ہزار جہت کہنے کا مطلب یہ ہے کہ انشائیہ نگار کے لئے پرسنل ہونا، اس لئے ضروری ہے کہ وہ اس طرح پرسنل ہو کر صرف اپنی ذات کا مشاہدہ نہیں کرتا بلکہ صحیح معنیٰ میں کائنات کے مشاہدے کا آغاز کرتا ہے۔''[1]

انشائیہ میں فنکار کی ذات کو ڈاکٹر سلیم اختر اسلئے ضروری سمجھتے ہیں کہ اس کے سبب ان کا منفرد نقطہ نظر سامنے آئے گا۔ انشائیہ نگار کی شخصیت بھی انشائیہ کو خاص رنگ عطا کر سکتی ہے۔ لیکن شخصیت کے یہ اثرات بالواسطہ طور پر ہونگے بلکہ اس لطیف انداز میں قاری کے دماغ پر اثر انداز ہوں گے کہ انہیں محسوس بھی نہ ہو۔ اور یہی انشائیہ نگار کا فنی کمال ہے کہ شخصیت چھن کر تحریر میں داخل ہوتی ہے۔ اس سلسلے میں قول ملاحظہ ہو:

''دراصل انشائیہ میں شخصیت کا اظہار اس نگاہ کی صورت میں ہوتا ہے جو انشائیہ نگار کو افراد، اشیاء، وقوعات اور حوادث الغرض زندگی کو ایک خاص انداز میں دیکھنے کا زاویہ مہیا کرتی ہے۔ ایسا زاویہ جو تازگی نظر کا باعث بن کر چیزوں کو مانوس تناظر سے ہٹا کر نئے تناظر میں لے آتا ہے یوں تو قاری چونک کر سوچتا ہے کمال ہے اس چیز کو میں نے اب تک اس پہلو سے کیوں نہیں دیکھا تھا اور اس کے بارے میں مجھے یہ بات کیوں نہ سوجھی تھی۔ قاری کے اسی چونکنے یا حیرت زدگی میں انشائیہ کی تازگی کا راز مضمر ہے۔ یہی وہ لطافت ہے جسے انشائیہ کے

[1] مشکور حسین، ممکنات انشائیہ، لاہور، ۱۹۸۳ء، ص ۸۸

لئے ضروری سمجھا جاتا ہے اور جس پر بطور خاص زور دیا جاتا ہے۔''[1]

انشائیہ میں اظہار ذات کا معاملہ نازک بھی ہے اور فنکاری کا مرہون منت بھی کیونکہ انشائیہ محض ذاتی معاملات یا تجربات کی فہرست سازی کا نام نہیں یہ زندگی کے مختلف مظاہر کی فنکارانہ پیشکش ہے۔ انشائیہ میں اظہار ذات کا عمل زندگی میں پیش آنے والے اظہار ذات سے مشابہ ہے۔

انشائیہ نگار بنیادی طور پر منفرد مزاج، منفرد رویے اور منفرد سوچ کا پاسدار ہوتا ہے۔ مختلف اشیاء کو منفرد نظریے سے دیکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ کبھی وہ اشیاء پر صوفیانہ نظر ڈالتا ہے تو کبھی ایک فلاسفر کی طرح غور وفکر کرتا ہے۔ کبھی وہ جمالیاتی فکر میں پوری طرح ڈوب جاتا ہے اور زندگی کے مختلف پہلوؤں میں حسن و لطافت ڈھونڈتا ہے۔ کبھی وہ اپنے مثبت رویے اور سوچ کے سبب زندگی کے پیچ وخم اور دشواریوں کو بھی خوشگوار بنا دیتا ہے۔ انشائیہ کے مزاج میں انشائیہ نگار کی شخصیت کے حوالے سے سب کچھ ہوسکتا ہے مگر ناامیدی نہیں۔ ناامید فرد انشائیہ کی تخلیق نہیں کرسکتا، یہ ایک آزاد ذہن کی پیداوار ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب انشائیہ نگار انشائیہ کی تخلیق کرتا ہے تو وہ زندگی کو روایتی طرز سے ہٹ کر ایک نئے زاویے سے پیش کرتا ہے اور اس عمل سے تحریر میں دل کشی اور حیرت انگیزی داخل ہو جاتی ہے۔ خصوصی طور پر انشائیہ کا مقصد ہی اجتماعی سوچ سے انحراف کرتے ہوئے ایک شخصی سطح کی سوچ کو بروئے کار لاکر زندگی کے نئے گوشوں اور پہلوؤں کو اجاگر کرتا ہے۔ اس سلسلے میں احمد ندیم قاسمی کا یہ قول ملاحظہ ہو:

> ''میرے نزدیک انشائیہ کسی خاص موضوع کے بارے میں ادیب کی سوچ کا عکس ہوتا ہے۔ اس صنف کی کوئی خاص معین صورت نہیں ہے ہر ادیب کا سلسلہ خیال دوسرے سے مختلف ہوسکتا ہے۔ اس میں حکمت کی گہرائی اور زندگی کی شگفتگی، مسائل حیات کی متانت اور ساتھ ہی ان کی ہلکی پھلکی ہیئتیں سبھی کچھ سما سکتا ہے۔ اس لئے میں انشائیہ پر کسی بھی ہیئت کی چھاپ لگانے کے مخالف ہوں اور نہ اس مؤقف کا حامی ہوں کہ جو شخص زندگی کو سر کے بل کھڑا ہو کر دیکھے وہی انشائیہ نگار ہے۔ انشائیہ جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے کہ ایک سلسلہ خیال کی

[1] ڈاکٹر سلیم اختر، انشائیہ کی بنیاد، عفیف پرنٹرس، دہلی، ۲۰۱۴ء، ص ۲۳۷۔۲۳۸

کڑیوں پر مشتمل ہوتا ہے اوراس کی حدود پر پہرے نہیں بٹھائے جا سکتے۔'' [۱]

انشائیہ میں شخصی نقطہ نظر کے حوالے سے کلیم الدین احمد نے اپنا اظہار خیال یوں کیا ہے:

''خط کی طرح انشائیہ بھی اپنی تلاش اور اپنی دریافت ہے جس میں انشائیہ نگار اپنے کردار کے سرچشموں کو پالیتا ہے، جس میں اس کی شخصیت کے متضاد عناصر ابھر آتے ہیں۔ یہ انمل، بے جوڑ اور ہم آہنگی سے عاری نظر آتی ہے۔ وہ اپنی کمزوریوں اور خامیوں کو ابھارتا ہے۔ وہ اس طرح سے ان سے نجات پا لیتا ہے۔ اس کا اصل موضوع اس کی شخصیت اور اس کی آزادی ہے۔ کیونکہ دانشمند وہی ہے جو اپنی شخصیت کو پالے اور اپنی فطری آزادی کو ہاتھ سے جانے نہ دے۔'' [۲]

انشائیہ کا موضوع شعوری یا غیر شعوری طور پر انکشاف ذات ہی ہے یعنی انشائیہ نگار براہ راست یا بالواسطہ اپنی شخصیت کے ان پہلوؤں کو اجاگر کرنے کی کوشش کرتا ہے جو معاشرے میں تحریات مانے جاتے ہیں، لیکن انشائیہ نگار کو چونکا دینے والی بات کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر سلیم اختر یوں لکھتے ہیں:

''غرض کچھ بھی کہا جائے یہ تشہیر ذات کا پہلو ہے اور وہ ہر شخص کی انا کو بہت تسکین دیتی ہے۔ اس کا اظہار بالواسطہ یا بلاواسطہ دونوں طرح ہو سکتا ہے۔ باالوسطہ صورت میں انشائیہ نگار شعوری یا غیر شعوری طور پر اپنی ذات کو موضوع بناتا ہے۔'' [۳]

ادب زندگی کا آئینہ ہوتا ہے اور ادیب بحثیت ایک ترجمان زندگی تمام حقائق کو اجاگر کرتا ہے۔ اسی طرح انشائیہ نگار بھی زندگی کے حقائق، مشاہدات، تجربات، احساسات و جذبات کو اپنی تحریر میں جگہ دیتا ہے۔ وہ اپنی زندگی کے کیفیات اور تجربات کو کسی اور دوسری صنف میں اتنے بہتر انداز میں نہیں پیش

۱۔ احمد ندیم قاسمی، بحوالہ ڈاکٹر سلیم اختر، انشائیہ کی بنیاد، عفیف پرنٹرس، دہلی، ۲۰۱۴ء، ص ۱۹۷

۲۔ کلیم الدّین، بحوالہ ڈاکٹر سلیم اختر، انشائیہ کی بنیاد، عفیف پرنٹرس، دہلی، ۲۰۱۴ء، ص ۱۸۸

۳۔ ڈاکٹر سلیم اختر، انشائیہ کی بنیاد، عفیف پرنٹرس، دہلی، ۲۰۱۴ء، ص ۱۷۱-۱۷۲

کرسکتا ہے جتنا انشائیہ نگاری میں کیوں کہ انشائیہ نگاری میں شخصی تجربات، تاثرات اور ذاتی رجحانات کو غیر رسمی انداز اختیار کرتے ہوئے ہلکے پھلکے الفاظ، لطیف وشگفتہ اسلوب میں بیان کیے جاتے ہیں۔ اور ان تمام چیزوں کو بیان کرنے کے لئے انشائیہ نگار آزاد ہوتا ہے۔ اس ضمن میں ڈاکٹر سلیم اختر کا یہ قول پیش ہے:

''اصل بات یہ ہے کہ انشائیہ خودنوشت سوانح عمری بھی نہیں ۔۔۔۔ اور نہ انشائیہ نگار اپنے حالات زیست ہی قلم بند کرتا ہے مگر نہ جانے کیا بات ہے کہ وہ 'عظیم' نہ ہونے کے باوجود اپنے خیالات، احساسات اور میلانات سے دوسروں کو آگاہ ضرور کرنا چاہتا ہے۔ دوسرے اس کی ذات میں کس قدر دلچسپی لیتے ہیں، یہ انشائیہ نگار کی ہنرمندی ہے۔'' [1]

مندرجہ بالا اقتسابات کی رو سے یہ واضح ہے کہ انشائیہ میں شخصیت کے ہر پہلو کو غیر رسمی طریق کار اختیار کرتے ہوئے منظر عام پر لایا جاتا ہے۔ اس میں انشائیہ نگار اپنے خیالات، احساسات، جذبات، مشاہدات و تجربات کو براہ راست یا بالواسطہ طور پر موضوع بناتا ہے اور اپنی ہنرمندی کا ثبوت دیتے ہوئے اس میں لطیف و دلکش نکتے پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے، اور یہی انشائیہ کا مغز تسلیم کیا جاتا ہے۔

زینت ساجدہ کے انشائیوں میں بھی ان کی شخصیت کے مختلف پہلو منکشف ہوتے ہیں۔ انہوں نے اپنی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کو بڑے ہی لطیف اور دلکش انداز میں قاری کے روبرو کیا ہے اور وہ زندگی کے واقعات اور معاملات کو ایک نئے رنگ میں ڈھال کر ایک نئی صورت میں پیش کرتی ہیں جس میں وہ اپنی ذات کو براہ راست یا بالواسطہ طور پر بے نقاب کرتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ شخصی نقطہ نظر کے حوالے سے ان کے ایک انشائیہ ''اگر میں مرد ہوتی'' کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو جس میں وہ خود کو بحیثیت ایک مرد اجاگر کرتی ہیں:

''امّاں کی ڈانٹ اور ابّا کے جوتے ہمارا انتظار کرتے، اور میں شاید آدھی آدھی رات تک سنیما ہال میں بیٹھا، ایکٹریسوں کی اداؤں پر نثار ہوا کرتا۔ چاندنی رات اور برسات کے موسم مجھے بہکانے کو کافی ہوتے۔ لکھنے پڑھنے اور محنت کرنے سے جی چراتا۔ گھر میں شکایت کرتا کہ شور وغل کے مارے پڑھنا نہیں ہوتا، اس

[1] ڈاکٹر سلیم اختر، انشائیہ کی بنیاد، عفیف پرنٹرس، دہلی، ۲۰۱۴ء، ص ۱۷۱

لئے ہاسٹل میں رہنا چاہیے اور ہاسٹل میں رہ کر خوش ہوتا کہ روکنے ٹوکنے والا کوئی نہیں۔ کبھی کبھار پڑھنے کا مظاہرہ کرتا، یوں کہ سامنے کتاب کھلی ہوئی ہے اور میں دوستوں سے لڑکیوں کے بارے میں معلومات آفریں تقریر کر رہا ہوں یا انہیں کے بارے میں سوچ رہا ہوں بظاہر عورتوں کو برا بھلا کہتا مگر بند کمرے میں دھڑکتے دل اور الجھتی سانسوں کو روکے عصمت کے افسانے پڑھتا۔'' [۱]

زینت ساجدہ کی انشائیوں میں شخصیت کے متضاد عناصر بھی نظر آتے ہیں اور انہوں نے اپنی شخصیت کے ان پہلوؤں کو براہ راست یا بالواسطہ طور پر انشائیوں میں بیان کیا ہے جس سے ان کا کردار نمایاں طور پر نظر آتا ہے۔ انہوں نے اپنی ذات کو موضوع بناتے ہوئے اپنی کمزوریوں اور خامیوں کو اجاگر کیا اور آزادانہ طور پر بہت ساری ضمنی باتیں بھی کہہ ڈالیں جو ان کی شخصیت کی عکاسی کرتی ہیں۔ مثال کے طور پر ان کے مختلف انشائیوں سے اقتباسات پیش ہیں:

''نبی بننا بہت بڑی بات ہے کوئی اور کام ڈھنگ سے کرلیں، کوئی فن جی لگا کر سیکھ لیں، لیکن ہر فن ریاضت چاہتا ہے اور ہر ریاضت کے لئے فرصت بھی چاہیے اور فراغت بھی۔ یہی کمبخت کی قسمت میں نہیں۔ فلسفہ ولسفہ بڑی باتیں ہیں چلیے افسانہ لکھ لیں۔ کیسی کیسی کہانیاں ان کانوں سے سنی ہیں اور کیسی کیسی باتیں ان آنکھیں دیکھی ہیں۔ کوئی بھی دلچسپ اور انوکھی بات مختصر افسانہ کی صورت میں لکھ دیں گے۔ ناول پھر بھی بڑی چیز ہے۔ چلئے کاغذ قلم لیا اور افسانہ لکھ رہی ہیں۔'' [۲]

مذکورہ بالا اقتباس میں انشائیہ نگار نے بالواسطہ طور پر اپنی کمزوریوں کا ذکر کرتے ہوئے اپنی ادبی دلچسپی کو بیان کیا ہے جو ان کی شخصیت کے ایک پہلو کو منکشف کرتا نظر آتا ہے۔

انشائیہ ''کباڑ خانے سے میوزیم تک'' میں بھی انشائیہ نگار کی شخصیت کا ایک پہلو نمایاں ہوتا ہے۔ اس انشائیہ میں انشائیہ نگار مرغیوں کے پالنے کے لیے غور و فکر کرتی نظر آتی ہیں جو ان کی دلچسپی کو ظاہر

[۱] اگر میں مرد ہوتی، اسلوب بیان اور، اردو مجلس، حیدر آباد، ۲۰۰۹ء، ص ۸۶

[۲] ہم ہیں تو ابھی راہ میں ہیں سنگ گراں اور، اسلوب بیان اور، اردو مجلس، حیدر آباد، ۲۰۰۹ء، ص ۲۸

کرتا ہے مثال کے طور پر اقتباس پیش ہے:

''ہم نے ایک زمانے میں یہ پلاننگ کر رکھی تھی کی ریٹائر ہوتے ہی مرغیاں پالیں گے۔کام کا کام اور انڈوں کے دام۔اس بارے میں وقتاً فوقتاً ماہرین سے مشورہ کرتے رہے۔متعلقہ لٹریچر فراہم کیا اور ذرا ذرا سی بات کی تفصیل سوچ لی۔بس یہ سمجھیے کہ پروگرام طے شدہ تھا لیکن ریٹائر ہونے سے پہلے ہی ایک نسخہ کیمیا ہاتھ لگ گیا۔'' ۱؎

اس ضمن میں انشائیہ ''میری مرغیاں'' کا ایک اقتباس پیش ہے جو انشائیہ نگار کا مرغیوں کے تئیں لگاؤ کو واضح کرتا ہے:

''خدا جانے کیوں بیٹھے بٹھائے مجھے خیال آیا کہ مرغیاں پالیں جائیں۔کٹ کٹ کرتی ادھر ادھر پھریں گی، آنگن بھرا بھرا لگے گا اور رونق آ جائے گی۔ادھر میرے جی میں یہ بات آئی ادھر میں نے اعلان کر دیا کہ اب اس گھر میں مرغیاں پلیں گی۔سب تو یوں ہی ہنسنے لگے کہ بھئی شوق ہو تو کوئی ڈھنگ کا ہو۔یہ ہے کیا تم مرغیاں پالنے چلی ہو، ہٹاؤ اسے، مگر دادی اماں نے صاف کہہ دیا کہ مرغیاں ہمارے ہاں پل نہیں سکتیں۔'' ۲؎

انشائیہ ''خالہ ماں سلام'' میں انشائیہ نگار نے خود کو ایک سماجی کارکن کی حیثیت سے ظاہر کیا ہے جس سے سماج کے ساتھ انکے معاملات منکشف ہوتے ہیں۔سماج میں موجودہ افراد کے ساتھ سماجی رشتہ نبھانے میں جو مشکلات درپیش آتی ہیں ان کا ذکر بھی خوب موجود ہے اور ساتھ ہی ساتھ انہوں نے عمل رد عمل اور اس کے مثبت و منفی اثرات بھی گنائے ہیں۔مثال کے طور پر اقتباس ملاحظہ ہو جو ان کے سماجی تجربات کو نمایاں کرتا ہے:

''ان باتوں میں آپ سے جھوٹ کیوں بولیں، ہمیں خود بھی دلچسپی ہے لیکن ڈرتے ہیں کہ اچھا ہوا تو خدا نے کیا اور برا ہوا تو اس چڑیل نے۔بڑی بوڑھی

۱؎ کباڑ خانے سے میوزیم تک، اسلوب بیان اور، اردو مجلس، حیدر آباد، ۲۰۰۹ء، ص ۸۹

۲؎ میری مرغیاں، اسلوب بیان اور، اردو مجلس، حیدر آباد، ۲۰۰۹ء، ص ۱۰۷

عورت کا قول ہے، اچھے اچھے پھول اللہ میاں کی درگاہ پر اور خراب خراب پھول بلی کے چونڈے میں، اور چونڈا مونڈنے کی دھمکی الگ۔ بس اس ڈر سے اس کارِ خیر میں حصہ نہیں لیتے ورنہ بڑا لالچ آتا ہے۔'' ۱؎

زینت ساجدہ نے اپنے انشائیوں میں مشاہدہ ذات کا سہارا لیتے ہوئے اپنے جذبات کو انشائیہ ''اگر اللہ میاں عورت ہوتے'' میں بڑے مزاحیہ انداز میں بیان کیا ہے۔ مثال کے طور پر اقتباس ملاحظہ ہو:

''اگر کوئی خواہ مخواہ ہمدردی جتائے اور جی بہلانے کی باتیں کرے تو جی یہی چاہتا ہے کہ اس کا منہ نوچ لوں، اس کے کان کھینچوں، دائیں کو بایاں اور بائیں کان کو دایاں کر دوں، بال کھسوٹ ڈالوں اور خدا جانے کیسی کیسی باتیں سوجھتی ہیں۔'' ۲؎

اس سلسلے میں ایک اور اقتباس انشائیہ ''مکان بنا ڈالا'' سے ملاحظہ ہو جوان کی خواہشات کو بیان کرتا ہے:

''دل کے کسی گوشے میں مدت سے یہ آرزو تھی کی ایک چھوٹا سا خوبصورت مکان بنائیں گے۔ اطراف وسیع زمین چھوڑ کر پھولوں اور پھلوں کا باغ لگائیں گے۔ باغ میں ایک پھول کا کنج ہوگا اور اس پر بیلیں چڑھائیں گے۔ ایک چھوٹا سا لوٹس پاؤنڈ ہوگا، قاز کے جوڑے ہری ہری دوب پر گردن لمبی کیے ادھر ادھر گھومیں گے۔ کبوتر چھتری پر گٹر گوں کریں گے اور ہم بید کی آرام کرسی پر بیٹھے ہوئے سویٹر بنا کریں گے۔ ہمارے میاں اخبار پڑھیں گے اور بچّے تتلیاں پکڑیں گے۔'' ۳؎

انشائیہ ''کاہ کروسنگھار پیا مورا اندھا'' کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو جس میں انشائیہ نگار نے اپنے جذبات کو بڑے شگفتہ انداز میں منعکس کیا ہے:

''ایک ہم ہیں دس روز تک وہیں ایک رنگ پہنے رہیں تو کبھی پلٹ کر یہ نہ پوچھا

۱؎ خالہ ماں سلام، اسلوب بیان اور، اردو مجلس، حیدر آباد، ۲۰۰۹ء، ص ۴۷

۲؎ اگر اللہ میاں عورت ہوتے، اسلوب بیان اور، اردو مجلس، حیدر آباد، ۲۰۰۹ء، ص ۱۷

۳؎ مکان بنا ڈالا، اسلوب بیان اور، اردو مجلس، حیدر آباد، ۲۰۰۹ء، ص ۴۳

کہ بھئی یہی کیوں پہنی ہو۔شادی بیاہ کی تقریب میں ساتھ جا رہے ہیں۔ ہاتھ کان بوچے، پر منہ سے نہ پھوٹے زیور پہن لونا۔ہم بھی انسان ہیں، دل رکھتے ہیں۔سوچ سوچ کر دل کڑھتا ہے۔ ہماری ملنے والیوں سے ذکر کیا تو کہنے لگیں، کسی اور سے دلچسپی ہوگی۔ہم نے کہا اس بات کی ہم قسم کھاتے ہیں کہ ہم سے پہلے ممکن ہے کسی ایک سے کیا، دس ہزار سے دلچسپی ہوگی، پر اب تو نظر ملانے کا بھی فخر حاصل نہیں کسی نے کہا، ان لوگوں کے مذاق کی تربیت کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔'' ۱؎

زندگی کی پیچیدگی سے آزادی اور خوشگوار لمحات کی طلب انسانی فطرت میں شامل ہے۔انشائیہ ''میں نے نوکری کی'' میں انشائیہ نگار اپنے آزادانہ خیال اور جذبات کا اظہار کچھ یوں کرتی نظر آتی ہیں۔اقتباس ملاحظہ ہو:

''جی چاہتا ہے کہ ہم بھی ذرا بنے ٹھنے رہیں، سلیقہ کے ساتھ جیئیں، نئے نئے فیشن کریں، پاس پڑوس والیوں سے گرما گرم اسکینڈل سنیں۔پھیری والے کو بلا کر سودا چکائیں۔اپنے گھر اوروں کو بلائیں، خاطر تواضع کی دھوم مچ جائے۔پاندان کی شہرت دور دور تک ہو۔کپڑوں کے معاملے میں سب ملنے والیاں ہماری ریس کریں۔۔۔شام ہوئی کہ ہم تیار ہو کر بچوں کے سامنے کھیلیں، ان کے جھگڑے چکائیں، ان سے پیار کریں، میاں آئیں تو ان کے دفتر کے کارنامے سنیں۔ان کے ساتھ گھومنے جائیں۔اللہ اللہ کیسی نعمتیں ہیں مگر برا ہو ہماری نوکری کا کہ یہی چیزیں ہمارے جی کو ہلکان کئے دیتی ہیں۔'' ۲؎

انشائیہ مکان بنا ڈالا کا ایک اور اقتباس پیش ہے جو انشائیہ نگار کہ غصّے کو ظاہر کرتا ہے:

''انہوں نے ہماری حماقت کو شاید تاڑ لیا۔اب حال یہ ہے کہ مستری آتا ہے تو وڈّر غائب، مزدوروں کا حال یہ ہے کہ کبھی برادری میں شادی ہے، کبھی سالے کے

۱؎ کاہ کروں کروں سنگھار پیا مورا اندھا، اسلوب بیان اور، اردو مجلس، حیدرآباد، ۲۰۰۹ء، ص ۶۵

۲؎ میں نے نوکری کی، اسلوب بیان اور، اردو مجلس، حیدرآباد، ۲۰۰۹ء، ص ۸۳

بہنوئی کا خالہ زاد بھائی مر گیا، کبھی پنچایت کا بہانہ ہے، کبھی آپس میں جھگڑے اور مار پیٹ کا رونا ہے۔ کبھی اور سیر صاحب بیمار کبھی انجینئر صاحب دورے پر۔ اکثر ہوتا یہ ہے کہ تپتی دھوپ میں سب غائب ہیں اور صرف ہم واحد حاضر، جھنجلا رہے ہیں، بل کھا رہے ہیں، غصہ پی رہے ہیں، کلیجہ چھلنی ہوا جاتا ہے۔'' [1]

انشائیہ ''چار مینار پر غلاف'' میں انشائیہ نگار بات سے بات پیدا کرتے ہوئے اپنی ذات کے ایک اہم پہلو کو بے نقاب کر جاتی ہیں۔ اس انشائیہ میں وہ اپنے تقریری فن کو اجاگر کرتے ہوئے خود کو ایک موثر خطیب تسلیم کرتی نظر آتی ہیں مثال کے طور پر اقتباس پیش ہے:

''ہم ایسے بے زبان تو ہیں نہیں کہ دو چار تقریریں نہ کر سکیں اور دو چار کی بھی کیا ضرورت ہے، ایک ہی تقریر منہ زبانی یاد کر لیں گے اور بار بار ریکارڈ بجانے کے طور پر دہرایا کریں گے۔ آخر کار پبلک کا جوش بھی تو کوئی چیز ہے۔ اب خون سرخ نہ سہی، بالکل سفید بھی نہیں ہوا ہے۔ کچھ نہ کچھ گلابی پن یا سرخی اب بھی باقی ہے۔ بس دھواں دھار تقریروں سے یا ایک ہی تقریر کو بار بار دھواں دے کر پبلک کو جوش میں لائیں گے اور اس پر آمادہ کر لیں گے کی کیوں نہ اس خوبصورت عمارت پر ایک غلاف چڑھا دیا جائے۔'' [2]

زینت ساجدہ نے اپنے انشائیوں میں اپنے شخصی نقطہ نظر یا ذات کو منکشف کرنے میں بہت ہی انوکھا انداز اختیار کیا ہے۔ انہوں نے اپنی شخصیت کے ہر پہلو کو براہ راست یا بالواسطہ طور پر شعوری یا غیر شعوری انداز میں پیش کیا ہے۔ انشائیہ میں اظہار ذات کا معاملہ بڑا ہی نازک ہوتا ہے اور اس کی کامیابی انشائیہ نگار کی ہنر مندی پر منحصر ہوتی ہے۔ زینت ساجدہ اس فن کو اپنانے میں کامیاب نظر آتی ہیں۔ انہوں نے اپنی ذات کو منکشف کرنے کے عمل میں قاری کو انوکھا اور غیر رسمی زاویہ مہیا کرایا جو غور و فکر کی ایک نئی سمت فراہم کرتا ہے۔

---

[1] مکان بنا ڈالا، اسلوب بیان اور، اردو مجلس، حیدر آباد، ۲۰۰۹ء، ص ۴۶

[2] چار مینار پر غلاف، اسلوب بیان اور، اردو مجلس، حیدر آباد، ۲۰۰۹ء، ص ۵۸

''میں'' کا تصور

انشائیہ میں شخصی نقطہ نظر کے حوالے سے ''میں'' کے تصور کو بہت اہمیت حاصل ہے۔یعنی انشائیہ نگار کی ذات براہ راست طور پر انشائیہ میں نمایاں طور پر نظر آتی ہے۔انشائیہ نگار صیغہ واحد متکلم کا استعمال کرتے ہوئے اپنی ''میں'' کو منظر عام پر لاتا ہے لیکن وہ اس تکنیک کو استعمال میں لاتے وقت فنکارانہ لہجہ کو اپناتا ہے جو قاری کے ذہن پر گراں نہیں گزرتا بلکہ وہ اس کے لطف ومسرت کا سبب بنت بنتا ہے۔شخصی نقطہ نظر کے سلسلے میں ڈاکٹر سلیم اختر نے اپنی رائے یوں رکھی ہے:

> ''یہ تو وثوق سے نہیں کہا جا سکتا کہ ہر انشائیہ محرک نرگسیت ہی بنتی ہے، یا کہ ہر انشائیہ نثری تعلّی ہوتا ہے لیکن اس کے باوجود ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ہر انشائیہ میں ''میں'' بہت نمایاں ہوتی ہے۔ بلکہ مجھے تو یہ محسوس ہوتا ہے گویا انشائیہ کی صنف کی اساس ہی میں پر استوار ہے ایسی اور کوئی ادبی صنف نہ ملے گی جو سرتا سر واحد متکلم کے اسلوب میں اظہار پاتی ہو۔'' [۱]

انگریزی ادب میں بعض نقادوں نے ایسے انشائیوں کو شخصی یا بے تکلف کی اصطلاح سے منسوب کیا ہے۔اس قسم کی تحریروں میں انشائیہ نگار اپنی ذات کو مرکز بناتا ہے۔ چنانچہ شخصی نقطہ نظر کی صفات میں ''میں'' کے تصور کی اہمیت کو اجاگر کرتے ہوئے نظیر صدیقی لکھتے ہیں:

> ''انشائیہ جیسی صنف ادب ''میں'' کے مظاہرے ہی کے لئے عالم وجود میں آئی ہے۔'' [۲]

انشائیہ یا ادب کی دیگر اصناف میں فنکار کی ''میں'' کا ظہور بعض پیچیدہ نفسی عوامل کے ذریعے ہی وجود میں آتا ہے۔کسی بھی فرد یا عمومی طور پر فنکاروں میں احساس محرومی پائی جاتی ہے اور یہ احساس مختلف قسم کے عوامل کی بدولت فنکار کی زندگی پر اثر انداز ہوتا ہے اور اس کا ردعمل بھی مختلف افراد میں یکساں طور پر نظر نہیں آتا ہے لیکن اتنا ضروری ہے کہ سبھی اس محرومی کے احساس سے آزاد ہونے کے لئے کسی نمونے کو اختیار

۱۔ ڈاکٹر سلیم اختر،انشائیہ کی بنیاد،عفیف پرنٹرس، دہلی،۲۰۱۴ء،ص ۲۲۴

۲۔ شہرت کی خاطر،بحوالہ ڈاکٹر سلیم اختر،انشائیہ کی بنیاد،عفیف پرنٹرس، دہلی،۲۰۱۴ء،ص ۱۷۲

کر لیتے ہیں جو مقصد حیات کی صورت میں بھی ہو سکتا ہے اور نظریہ حیات کی صورت میں بھی۔ اس کی نوعیت تعمیری بھی ہو سکتی ہے اور نقصان دہ بھی۔

زینت ساجدہ کے انشائیوں کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ انہوں نے اپنی ذات کے انکشاف میں ''میں'' کی اس تکنیک کو خصوصی اہمیت دی ہے۔ چنانچہ انشائیہ ''اگر اللہ میاں عورت ہوتے'' میں وہ اس تکنیک کا سہارا لیتے ہوئے اپنے احساس کی ترجمانی یوں کرتی ہیں:

> ''معلوم نہیں درد کم ہو گیا تھا نہیں، حد سے گزر کر دوا ہو گیا تھا اور میں نے سوچنا شروع کیا کہ واقعی اللہ میاں کہیں نہ کہیں ضرور موجود ہے۔ آس پاس ہوگا۔ شہ رگ سے بھی قریب جو اتنی جلدی سن لیتا ہے۔ جبھی تو دل کے ساتھ ساتھ دھڑکتا ہے۔'' [1]

انشائیہ ''کاہ کروسنگھار پیا مورا اندھا'' میں بھی انشائیہ نگار اپنی ذات کے حوالے سے اپنی خواہشات کو بیان کرنے میں اس تکنیک کو یوں بروئے کار لاتی ہیں۔ اقتباس ملاحظہ ہو:

> ''ایک بار میں نے کہا دیکھنا، میں اب کی عید پر انگور گوشے لونگی۔ وہی جو اس دن رام رتن جی کی بیوی کانوں میں پہن کر آئی تھیں۔ کیسے خوبصورت دکھائی دے رہے تھے۔ انگور گوشے غلط ترکیب ہے انگور کے خوشے کہو۔ کھانے کی چیز وہ بھلا کیوں پہن کر آئی تھیں؟ میں زچ آ کر کہتی ہوں، وہ زیور ہے جو کانوں میں پہنا جاتا ہے، انگور کے خوشے کی طرح کا۔ کان کی رعائت سے گوشے کہتے ہیں۔'' [2]

مذکورہ بالا اقتباس میں انشائیہ نگار نے اپنی خواہشات کو بڑے ہی لطیف انداز میں بیان کیا ہے جو ان کی شخصیت میں ''میں'' کے پہلو کو بے نقاب کرتا ہے۔

اسی طرح ایک اور انشائیہ ''اگر میں مرد ہوتی'' میں انشائیہ نگار نے اپنے جذباتی پہلو کو بیان کرنے کے لئے صیغہ واحد متکلم کا اسلوب اپنایا ہے۔ اقتباس پیش ہے:

۱۔ اگر اللہ میاں عورت ہوتے، اسلوب بیان اور، اردو مجلس، حیدر آباد، ۲۰۰۹ء، ص ۱۸

۲۔ کاہ کروں کروں سنگھار پیا مورا اندھا، اسلوب بیان اور، اردو مجلس، حیدر آباد، ۲۰۰۹ء، ص ۶۴

''کبھی میں نے سوچا ہی نہیں اگر میں مرد ہوتی تو کیا کرتی بات یہ ہے کہ عورت ہونے کی رنگینیوں نے اتنا متوجہ رکھا کی کبھی اتنی فرصت ہی نہیں ملی کی بیٹھی سوچتی کہ اگر زید ہوتی تو کیا کرتی اور بکر ہوتی تو کیا کرتی۔ ہاں وقتی طور پر کبھی کبھی جی چاہتا ہے کہ اللہ اگر ہمیں آئندہ جنم دے تو مرد بنا کر دنیا میں بھیجے (ویسے میں تناسخ کی قائل نہیں)۔''[1]

انشائیہ ''میری مرغیاں'' میں بھی انشائیہ نگار کی انا نظر آتی ہے۔ مثال کے طور پر اس انشائیہ کا ایک اقتباس پیش ہے:

''اب مرادوں کے دن لگے ایک مرغا بنا اور ایک مرغی۔ مرغا کیسا سینہ تانے، بازو پھیلائے، اکڑا اکڑا پھرتا، اور مرغی ڈری سہمی لجائی شرمائی اس کے ساتھ ساتھ ہوتی۔ اب دانہ کھانے میں دونوں کی لڑائی نہ ہوتی۔ مرغی دانہ چگتی اور مرغا فخریہ انداز میں سینہ تانے کھڑا رہتا کیوں نہ ہو آخر میرا مرغا تھا۔ سوسائٹی کے سارے آداب سے واقف۔ اب یہ بات اور ہے کہ میں ذرا بھی تہذیب والی نہیں۔''[2]

انشائیہ میں انشائیہ نگار کو اپنی ''میں'' کو بیان کرنے میں اختصار بہت ضروری ہے۔ بعض اوقات فنکار اپنی میں کو ظاہر کرنے میں بہت ساری اضافی بات کہہ جاتے ہیں جس سے اس کا فنکارانہ توازن بگڑ جاتا ہے اور قاری کو طوالت کا احساس ستانے لگتا ہے۔ زینت ساجدہ نے اپنے انشائیوں میں اس تکنیک کو بیان کرتے وقت بڑی ہی احتیاط سے کام لیا ہے اور باتوں کو بڑے ہی مختصر انداز میں سمیٹ دیا ہے۔

موضوع کا ہم آہنگ نہ ہونا

اصناف ادب میں انشائیہ کو ایک لطیف صنف تسلیم کیا جاتا ہے۔ کسی مضمون کو جب ایک خاص انداز میں تحریر کیا جاتا ہے جو ظاہری طور پر بے ترتیب نظر آتا ہے لیکن اس میں ایک شعوری ربط و تسلسل موجود

۱۔ اگر میں مرد ہوتی، اسلوب بیان اور، اردو مجلس، حیدرآباد، ۲۰۰۹ء، ص ۸۵

۲۔ میری مرغیاں، اسلوب بیان اور، اردو مجلس، حیدرآباد، ۲۰۰۹ء، ص ۱۰۸

ہوتا ہے تو وہ انشائیہ کی صورت اپنا لیتا ہے۔انشائیہ نگار بات سے بات پیدا کرتے ہوئے موضوع کے حوالے سے بہت ساری غیر ضمنی باتیں بھی بیان کر جاتا ہے جو انشائیہ میں بے ترتیبی پیدا کرتی ہیں۔اور یہ بے ترتیبی انشائیہ کی ایک اہم صفت شمار کی جاتی ہے۔اس سلسلے میں غلام اصغر جیلانی لکھتے ہیں:

''انشائیہ ایک ایسی نثری صنف ہے جو اتنی ہی بے ربط ہے جتنی کی زندگی خود اور جس طرح زندگی کے آخر میں حیاتیاتی وحدت وجود میں آتی ہے اسی طرح انشائیہ کے منتشر اجزاء میں دیکھتے ہی دیکھتے ایک وحدت تاثر پیدا ہو جاتی ہے۔''[1]

انشائیہ دراصل مضمون کی ہی ایک غیر رسمی تحریری شکل ہے۔مضمون اور انشائیہ میں تفریق اسی بنیاد پر کی جاتی ہے کہ مضمون کے مواد کی پیشکش میں ایک منطقی ربط و تعلق ہوتا ہے۔اس کے برعکس انشائیہ میں موضوع سے ربط و تعلق تو ہوتا ہے لیکن اس میں کوئی منطقی ربط نہیں ہوتا بلکہ کئی ضمنی باتوں کے ذریعے انشائیہ نگار اپنی ذات کے مختلف پہلوؤں کو آشکار کرتا ہے۔مضمون کا مقصد عالمانہ انداز میں قاری کی اصلاح کرنا یا معلومات فراہم کرنا ہوتا ہے جب کہ انشائیہ میں معلومات اور اصلاح سے زیادہ تاثرات کی اہمیت ہوتی ہے اور یہ تاثرات انشائیہ نگار کی ذہنی ترنگ پر مشتمل ہوتے ہیں۔اس لئے انشائیہ نگار واقعہ سے زیادہ واقعات کے ردعمل پر توجہ دیتا ہے اور زندگی میں رونما ہونے والے معمولی سے معمولی واقعات اور حادثات کو بات سے بات پیدا کرتے ہوئے اشاروں میں بیان کر جاتا ہے۔اس سلسلے میں نظیر صدیقی اپنے انشائیوں کے مجموعہ ''شہرت کی خاطر'' کے دیباچہ میں لکھتے ہیں:

''انشائیہ ادب کی وہ صنف ہے جس میں حکمت سے لے کر حماقت تک اور حماقت سے لے کر حکمت تک کی ساری منزلیں طے کی جاتی ہیں یہ وہ صنف ادب ہے جس میں بے معنی باتوں میں معنیٰ تلاش کئے جاتے ہیں اور بامعنیٰ باتوں میں مہملیت اور مجہولیت اجاگر کی جاتی ہے۔۔۔۔۔۔یہ وہ صنف ادب ہے جس میں عنوان اور نفس مضمون میں وہی نسبت ہے جو کھونٹی اور لباس میں ہے۔ یہ وہ صنف ادب ہے جس میں عنوان کا مضمون سے مربوط ہونا اتنا ضروری نہیں جتنا

---

[1] غلام اصغر جیلانی، انشائیہ کیا ہے؟ اوراق، انشائیہ و افسانہ نمبر، مارچ۔اپریل ۱۹۷۲ء، ص ۲۳۰

مضمون کا مضمون نگار سے متعلق ہونا ضروری ہے۔'' ۱

مذکورہ اقتباس کے پیش نظر یہ واضح ہے کہ انشائیہ نگار اپنے موضوع کے حوالے سے معمولی سے معمولی باتوں کا ذکر کرتے ہوئے اپنے احساسات اور جذبات کو انوکھے انداز میں بیان کرتا ہے جس میں باہمی ربط کو اہمیت نہیں دی جاتی ہے۔ اسی سلسلے میں موضوع میں بے ترتیبی کی اہمیت کو بیان کرتے ہوئے وزیر آغا اپنی رائے یوں پیش کرتے ہیں:

''انشائیہ کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں موضوع کی مرکزیت تو قائم رہتی ہے لیکن اس مرکزیت کا سہارا لے کر بہت سی ایسی باتیں بھی کہہ دی جاتی ہیں جن کا بظاہر موضوع سے کوئی گہرا تعلق نہیں ہوتا۔ دوسرے لفظوں میں ایک مقالے کی بہ نسبت انشائیہ کا ڈھانچہ کہیں زیادہ لچیلا ہوتا ہے اور اس میں مقالے کی سنگلاخی کیفیت موجود نہیں ہوتی۔ اس کے علاوہ انشائیہ میں ایک مرکزی خیال کے باوصف دلائل کا کوئی منضبط سلسلہ قائم نہیں کیا جاتا۔'' ۲

انشائیے کے عنوانات کا موضوع سے ہم آہنگ نہ ہونے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ عنوان ایک سرے سے موضوع سے جدا نظر آئے اور جس کی مدد سے موضوع کا اندازہ لگانا بھی مشکل نظر آنے لگے۔ بعض اوقات انشائیہ نگار اس پر کم توجہ دیتے ہیں جس سے عنوان اور موضوع کے درمیان معقول غیر ہم آہنگی پیدا کرنے سے قاصر رہ جاتے ہیں۔ اس کی اہمیت کو ڈاکٹر سلیم اختر یوں بیان کرتے ہیں:

''ایک اور خصوصیت جس کی طرف کم توجہ دی جاتی ہے کہ بعض اوقات انشائیہ کے عنوان نفس موضوع سے لاتعلق ہی نہیں ہوتے بلکہ ایک سرے سے اس کی تکذیب کرتے نظر آتے ہیں اور ایسے عنوانات سے موضوع کا صحیح اندازہ نہیں لگایا جاسکتا۔'' ۳

مندرجہ بالا اقتباسات سے واضح ہوتا ہے کہ انشائیہ میں انشائیہ نگار اپنی ذات کے مخفی پہلوؤں کو

۱۔ شہرت کی خاطر، بحوالہ ڈاکٹر سلیم اختر، انشائیہ کی بنیاد، عفیف پرنٹرس، دہلی، ۲۰۱۴ء، ص ۱۸۶

۲۔ وزیر آغا، انشائیہ کے خدوخال، لبرٹی آرٹس پریس، دہلی، ۱۹۹۱ء، ص ۱۱

۳۔ ڈاکٹر سلیم اختر، انشائیہ کی بنیاد، عفیف پرنٹرس، دہلی، ۲۰۱۴ء، ص ۱۷۶

بے نقاب کرنے کے لئے بات سے بات پیدا کرتا ہے اور یہ تکنیک انشائیہ میں بے ترتیبی اور عنوان کو موضوع سے لاتعلق کرتی نظر آتی ہے۔لیکن قاری کو شعوری طور پر اس بے ترتیبی اور عنوان سے موضوع کی غیر ہم آہنگی کا احساس نہیں ہوتا ہے، یہ غیر منطقی ربط و تسلسل قاری کو بے چین نہیں کرتا ہے بلکہ زندگی کے حقائق کو بیان کرنے کے انوکھے انداز کی بدولت قاری کو غور وفکر کا ایک نیازاویہ فراہم کرتا ہے۔

زینت ساجدہ کے انشائیے بھی اسی صفت سے خالی نہیں ہیں۔انہوں نے اپنے عنوانات کو موضوع سے بہت حد تک ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی ہے لیکن کہیں کہیں ان کے انشائیوں کے عنوانات موضوع یا نقطہ نظر سے مختلف نظر آتے ہیں۔انشائیہ میں چونکہ انشائیہ نگار غیر رسمی طریقہ اختیار کرتے ہوئے موضوع کے حوالے سے بہت ساری باتیں بیان کر جاتا ہے جس کی بدولت وہ نقطہ نظر سے منحرف ہو جاتا ہے لیکن موضوع میں ایک ربط و تسلسل قائم رہتا ہے جو قاری کی دلچسپی کو ضائع ہونے نہیں دیتا ہے۔زینت ساجدہ نے بھی اپنے موضوع کے حوالے سے بہت ساری باتیں ایسی بھی بیان کر ڈالی ہیں جن کا انشائیہ کے عنوانات سے تعلق نظر نہیں آتا ہے۔مثال کے طور پر ان کے انشائیہ ''ہم ہیں تو ابھی راہ میں ہیں سنگِ گراں اور'' کا ایک اقتباس پیش ہے:

> ''ہیرو چاندنی رات میں ہیروئن سے کچھ اچھی بات کہنے والا ہے کیونکہ منظر یہاں تک اس طرح لکھا گیا ہے۔۔۔''گرمیوں کی رات ہے، چاند آدھا نہ پورا، اندھیرا نہ پورا اجالا، ہوا رکی رکی سی ہے مگر تھم تھم کر چلتی ہے تو اپنے ساتھ عجیب بے نام خوشبو کو اڑا لاتی ہے۔ان خوشبوؤں میں یادیں گھلی ہیں۔انہیں میں نجمہ کا بچپن ہے، گڑیوں کے گھروندے ہیں، باپ کا پیار ہے اور بیمار ماں کے آنسو ہیں۔وہ پچھلی باتوں کو یاد کرتی کرتی کھوسی گئی۔۔۔۔مگر چونک اٹھی، آہٹ ہوئی، بے شک حسن سامنے کھڑا تھا۔وہ خواب نہیں دیکھ رہی تھی۔اس کے بچپن کا ہمجولی حسن سچ مچ جیتا جاگتا سامنے کھڑا تھا اس نے کہا نجمہ۔۔۔۔'' [1]

مذکورہ بالا اقتباس کے حوالے سے انشائیہ نگار نے اپنی شخصیت کے ایک پہلو کو اجاگر کرنے کے

[1] ہم ہیں تو ابھی راہ میں ہیں سنگ گراں اور، اسلوب بیان اور، اردو مجلس، حیدرآباد، ۲۰۰۹ء، ص ۲۸

لئے افسانوی طرز تحریر کو موضوع بنایا ہے۔ جس سے انشائیہ کے عنوان اور موضوع میں ہم آہنگی نظر نہیں آتی ہے لیکن یہ غیر ہم آہنگی قاری کی دلچسپی کو ضائع نہیں ہونے دیتی ہے۔

انشائیہ میں انشائیہ نگار کی ذات کا اظہار ضروری سمجھا جاتا ہے۔ اس میں عنوان کا مضمون سے تعلق ہو نہ ہو لیکن موضوع انشائیہ نگار کی ذات سے ضرور تعلق رکھتا ہو۔ زینت ساجدہ کے مختلف انشائیوں میں بھی یہ صفت نظر آتی ہے۔ مثال کے طور پر یہ اقتباس پیش ہے:

''اخباروں میں چھپی خبروں کو پڑھ پڑھ کر، جو بڑے آدمیوں کے چھوٹے کاموں بلکہ کارناموں کے متعلق ہوتی ہیں، کبھی کبھی ہمارا جی چاہتا ہے کہ بھائی دنیا میں آئے ہو تو ایسا کچھ کر کے چلو کی بہت یاد رہو۔ بناسپتی گھی کھا کر لوگوں کا حافظہ یوں بھی خراب ہوتا جا رہا ہے، بہت دنوں تک نہ سہی کچھ دنوں کے لیے ہی سہی، یاد رہنے کی کوشش کیوں نہ کریں۔ آخر ہم میں کیا برائی ہے کہ بڑا آدمی نہ بنیں، جبکہ اس برائی میں ہینگ لگے نہ پھٹکری اور رنگ کا چوکھا آنا بالکل یقینی ہے۔ چلئے، اب تو سوچ لیا کہ بڑا آدمی بنیں گے۔''[1]

مذکورہ بالا اقتباس زینت ساجدہ کے انشائیہ ''چار مینار پر غلاف'' سے ماخوذ ہے۔ اس اقتباس کے موضوع کا انشائیہ کے عنوان سے تعلق نظر نہیں آ رہا ہے اور اس میں کوئی منطقی ربط بھی نہیں ہے لیکن پھر بھی انشائیہ نگار نے اپنی شخصیت کے اظہار کے لئے اس کو موضوع کا حصہ بناتے ہوئے ایک ربط و تسلسل پیدا کرنے کی کوشش کرتی ہیں جس سے انشائیہ میں دلچسپی قائم رہے۔

انشائیہ ''کاہ کروں سنگھار پیا مورا اندھا'' میں زینت ساجدہ نے اپنے احساسات و تجربات کو بیان کرنے کے لئے مختلف ذہنی باتوں کا سہارا لیا ہے جس کی بدولت انشائیہ کے موضوع اور اس کے نقطہ نظر میں ہم آہنگی نظر نہیں آتی ہے۔ مثال کے طور پر اقتباس دیکھئے:

''مثلاً دیکھیے ہم دونوں کی دعوت ہے۔ کسی وجہ سے صرف وہی چلے گئے۔ ننھے بچے کو بہلانے میں گھر پر رہ گئی۔ ہوں تو گھر میں پر سارا دل دعوت میں ہے۔

---

[1] چار مینار پر غلاف، اسلوب بیان اور، اردو مجلس، حیدر آباد، ۲۰۰۹ء، ص ۵۸

واپس آتے ہیں تو بڑے اشتیاق سے پوچھتی ہوں، کہیے نیلم پری اور پکھراج رانی آئی تھیں۔ جواب ملے گا آئی ہوں گی میں نے دیکھا ہی نہیں۔'' [1]

اسی انشائیہ کا ایک اور اقتباس ملاحظہ ہو جس کا موضوع انشائیہ کے عنوان سے بالکل لاتعلق نظر آتا ہے:

''ابھی پرسوں کی بات ہے، آئے تو بڑے خوش۔ باہر ہی سے چلاتے شور مچاتے ہوئے دیکھئے جناب کیا لایا ہوں۔ آپ بھی کیا یاد کریں گی کہ کیسا آدمی ملا ہے۔ ہم بوکھلائے ہوئے دیکھنے پہنچے۔ واقعی کچھ لائے ضرور ہیں۔ پیکٹ کھلا، نہایت بوسیدہ کرم خوردہ کتاب، دل بیٹھ گیا، پہچانا کیا لایا ہوں۔ عزلت کا ''ساقی نامہ'' بہت قدیم نسخہ ہاتھ لگا ہے۔ میرا تو خیال ہے، یہ اس کی زندگی ہی میں لکھا گیا ہے نادر چیز، کاغذ اور رنگ آبادی خط ثلث میں لکھا گیا ہے۔ میں نے سوچا لاؤ بیوی کو تحفہ دیں۔ ڈیڑھ سو کوئی بات نہیں، اب تم جلدی سے قلم سنبھالو اور اس پر کام کر ڈالو۔ ہم کھسیائے ہوئے ان کا دل رکھنے کو ہاں میں ہاں ملاتے رہے۔'' [2]

مندرجہ بالا اقتباس کے حوالے سے انشائیہ نگار بات سے بات پیدا کرتے ہوئے اپنے احساسات کو بیان کرتی ہیں جس سے انشائیہ کے موضوع اور عنوان میں ہم آہنگی قائم نہیں رہتی ہے۔ اس کے علاوہ ان کے دیگر انشائیوں میں بھی یہ صفت دیکھنے کو ملتی ہے۔

مذکورہ بالا مثالوں کی روشنی میں یہ واضح ہے کہ زینت ساجدہ کے دیگر انشائیوں کے موضوع بھی اس کے عنوان سے پوری طرح ہم آہنگ نہیں ہیں یا اس کی ایک سرے سے تکذیب کرتے نظر آتے ہیں لیکن یہ لاتعلقی اور غیر ہم آہنگی سے انشائیہ کے موضوع کا ربط و تسلسل نہیں ٹوٹتا ہے جو قاری کی توجہ کو منحرف نہیں ہونے دیتے ہیں۔

۱۔ کاہ کروں کروں سنگھار پیا مورا اندھا، اسلوب بیان اور، اردو مجلس، حیدر آباد، ۲۰۰۹ء، ص ۶۴

۲۔ کاہ کروں کروں سنگھار پیا مورا اندھا، اسلوب بیان اور، اردو مجلس، حیدر آباد، ۲۰۰۹ء، ص ۶۷

انشائیہ کا موضوع

جس طرح اردو شاعری کا موضوع یا مواد یا مزاج انگریزی شاعری سے مختلف ہے اور مختلف ہونا فطری بھی ہے کیونکہ ہمارا جغرافیائی نظام اور تہذیب وثقافت انگریزوں سے مختلف ہے اور اسی بنیاد پر انگریز انشائیہ نگاروں نے جو موضوعات اپنے انشائیوں کے لیے منتخب کیے وہ ہماری پسند سے مختلف نظر آتے ہیں۔انشائیہ نگار بنیادی طور پر اپنا موضوع اپنے اطراف واکناف کے ماحول سے ہی منتخب کرتا ہے اگر انشائیہ نگار کسی ایسے موضوع پر قلم اٹھاتا ہے جس سے قاری ناواقف ہیں تو یقیناً وہ انشائیہ قاری کو لطف اندوز نہ کر سکے گا اور ناکامی کا شکار ہوگا۔

دراصل انشائیہ کے لیے موضوع کا انتخاب کرنا ایک مشکل عمل ہے کیونکہ انشائیہ کسی موضوع کا پابند نہیں ہوتا بلکہ انشائیہ میں منتخب موضوع کا سہارا لے کر زندگی کے مختلف پہلوؤں کا احاطہ کیا جاتا ہے اور ایسا غیر معمولی زاویہ تلاش کیا جاتا ہے جسے پڑھنے والوں کو غور وفکر کی ایک نئی راہ مل سکے۔انشائیہ کے موضوع کے حوالے سے احمد ندیم قاسمی کی یہ رائے ملاحظہ ہو:

> ''انشائیہ کے لئے موضوع کی کوئی قید نہیں ہوتی۔اپنی ذات کے بارے میں لکھیے،کائنات کے بارے میں لکھیے کسی ایک نکتہ پر زور دیجئے یا بہت سے نکات کو باہم مربوط کر دیجئے۔آپ جو چاہیں کیجیے یعنی اپنے خیالوں،جذبوں،تجربوں اور مشاہدوں کے ساتھ کھل کر کھیلئے۔'' [۱]

احمد ندیم قاسمی کی رائے میں اگر محمد سہیل عمر کی یہ رائے شامل کر لی جائے تو انشائیہ میں موضوعات کی وسعت کو با آسانی اندازہ لگایا جاسکتا ہے:

> ''انشائیہ میں انشائیہ نگار موضوع کے حوالے سے اپنے تجربات، احساسات،خیالات اور جذبات کو اس طرح سموتا ہے کی وہ اس کے داخل کے ترجمان ہونے کے ساتھ ساتھ خارج کے نمائندہ بھی بن جاتے ہیں۔'' [۲]

۱۔ احمد ندیم قاسمی،بحوالہ ڈاکٹر سلیم اختر،انشائیہ کی بنیاد،عفیف پرنٹرس،دہلی،۲۰۱۴ء،ص ۲۸۸

۲۔ محمد سہیل عمر،بحوالہ ڈاکٹر سلیم اختر،انشائیہ کی بنیاد،عفیف پرنٹرس،دہلی،۲۰۱۴ء،ص ۳۸۲

ڈاکٹر آدم شیخ نے اپنی مرتبہ ''انشائیہ'' میں ''خط وخال'' کے عنوان سے جو مقدمہ شامل کیا ہے اس میں انہوں نے انشائیہ کے ''خط وخال'' اجاگر کرتے ہوئے یہ کہا کہ:

> ''انشائیے ایک ذہین، رنگین مزاج، ترقی پسند اور روایت شکن فنکار کے جذبات پہ احساسات کا پرتو ہی ہوتے ہیں۔ ایک انشائیہ میں لکھنے والے کے ان دبے ہوئے جذبات کا اظہار ہوتا ہے جن کی راہ میں اس کے عہد کی سماجی، مذہبی اور اخلاقی رکاوٹیں حائل ہوتی ہیں۔ انشائیہ نگار مروجہ اور فرسودہ روایتوں سے مانوسیت اور مطابقت پیدا کرنے میں ناکام رہتا ہے اس کے انفرادی نظریات اور ذہنی کشمکش اظہار کے ذرائع ڈھونڈتی ہے۔ ادیب اس اظہار کے لئے زبان اور تحریر کا سہارا لیتا ہے۔ لیکن اصناف ادب میں بھی جو تحریریں انشائیہ نگار کے نئے اور معنیٰ خیز خیالات کی حامل ہوتی ہیں۔ ایسے مواد، ہیئت اور انداز بیان کی وجہ سے دوسری تحریروں سے منفرد ہوتی ہیں یہی انشائیہ ہیں۔'' [1]

مذکورہ اقتباس میں ڈاکٹر آدم شیخ نے انشائیہ کو ایک رنگین اور ترقی پسند خیالات کی پیداوار بتایا ہے۔ اس میں انشائیہ نگار سماج میں رائج فرسودہ روایات سے مطابقت پیدا کرنے میں ناکام رہتا ہے اور ان فرسودہ روایات کو بیان کرنے کے لئے اس صنف کو وسیلے کے طور پر اختیار کرتا ہے اور ایک جداگانہ انداز اپناتے ہوئے اپنے نظریات کا اظہار کرتا ہے اور یہی جداگانہ انداز بیان انشائیہ ہے۔

''اردو ایسیز'' کے مرتب ڈاکٹر ظہیر الدّین نے انشائیہ کے موضوع کے حوالے سے اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے یہ بتایا ہے کہ انشائیہ نگار ذاتی تجربات ومشاہدات کی بنیاد پر زندگی کے کسی بھی پہلوؤں کو اپنی تحریر میں جگہ دے سکتا ہے۔ چاہے پند ونصیحت کے طور پر یا طنز مزاح کے طور پر وہ اس کو استعمال کرے۔ قول پیش ہے:

> ''اِیسّے نگار اپنے ذاتی تجربوں اور مشاہدوں کی روشنی میں حیات وممات اور حوادث کائنات سے متعلق شوخی بیان کے ساتھ بعض اوقات صاف صاف اور بعض اوقات رمز وکنایہ میں کسی اخلاقی پہلو کو پیش کرتا ہے۔۔۔۔۔ اِیسّے نگار کی

[1] انشائیہ، بحوالہ ڈاکٹر سلیم اختر، انشائیہ کی بنیاد، عفیف پرنٹرس، دہلی، ۲۰۱۴ء، ص ۱۹۰-۱۹۱

کامیابی کا گُر اس میں مضمر ہوتا ہے کہ وہ پند و نصیحت، طنز و مزاح اور لطافت زبان و بیان کو کام میں لاتا ہے یہی وجہ ہے کہ ایسے نگار کے لئے ازسمک تا سما ہر شئے موضوع کا کام دیتی ہے اور حقیر سے حقیر شئے کی اہمیت اور حسن کو اجاگر کر دیتا ہے۔'' ۱؎

انشائیہ مضمون نگاری کی مختص شکل ہے۔ اس کا غیر رسمی انداز ہی اسے مضمون سے جدا کرتا ہے۔ اس کا موضوع غیر سنجیدہ ہوتا ہے اور اس میں زندگی کے کسی بھی عام معاملات کو ایک نئے نظریے سے دیکھا جاتا ہے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر عبادت بریلوی نے اپنے مخصوص اسلوب میں انشائیہ کو یوں بیان کیا ہے:

''انشائیہ مضمون نگاری کا ایک مخصوص انداز ہے اس میں بعض ایسے پہلو ہوتے ہیں جن کا ہر مضمون میں پایا جانا ضروری نہیں۔ انشائیہ کا موضوع عام طور پر علمی اور تحقیقی نہیں ہوتا۔ معلومات کا فراہم کرنا اس کا مقصد نہیں اس کی نوعیت ذاتی اور انفرادی ہوتی ہے۔ ایک داخلی آہنگ بھی اس میں پایا جاتا ہے جس کی حدیں غنایت سے جا ملتی ہیں۔ اس کا تعلق عام زندگی سے ہوتا ہے اس زندگی کے عام معاملات اس میں پیش کئے جاتے ہیں ان معاملات کے نشیب و فراز تصویر کشی کی جاتی ہے۔'' ۲؎

انشائیہ میں شخصی نقطہ نظر اور انکشاف ذات کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا لیکن فنکار اپنی ذات کو منکشف کرنے کے ساتھ ساتھ وہ اپنے زمانے کو نظر انداز نہیں کرتا ہے۔ انشائیہ کی امتیازی صفت یہ ہے کہ اس میں عصری آگہی کے آثار تخلیق کی سطح کے ساتھ چپکے نظر نہیں آتے بلکہ ایک مخصوص عمل سے گذرنے اور بدلنے کے بعد ہی قاری کے سامنے آتے ہیں۔ انشائیہ میں عصری آگہی معروضی طور پر نہیں ہوتی بلکہ انشائیہ عصری آگہی کو بھی ایک نئی شکل و صورت فراہم کرتا ہے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر سلیم اختر نے اپنی اظہار رائے یوں رکھی ہے:

''ہمارے انشائیہ کی انفرادیت بھی اسی میں مضمر ہے کہ اس نے ماحول کے زیر اثر

۱؎ اردو ایسّیز، بحوالہ ڈاکٹر سلیم اختر، انشائیہ کی بنیاد، عفیف پرنٹرس، دہلی، ۲۰۱۴ء، ص ۱۹۱

۲؎ انشائیہ نگاری، بحوالہ ڈاکٹر سلیم اختر، انشائیہ کی بنیاد، عفیف پرنٹرس، دہلی، ۲۰۱۴ء، ص ۱۹۱۔۱۹۲

روح اثر کی ترجمانی کی اور یوں اپنا تشخص برقرار رکھا اسے بعض حضرات ادبی بدعت سمجھتے ہیں۔ میں ان سے ان کا اجتہاد سمجھتا ہوں۔ انشائیہ ہی نہیں بلکہ کسی بھی صنف ادب کے کسی دوسرے ملک غیر زبان اور بیگانہ کلچر میں پنپنے یا فروغ پانے یا مقبولیت حاصل کرنے کے لئے یہی بنیادی شرط طے پاتی ہے کہ وہ اس قوم کے مخصوص مزاج اور اجتماعی شعور کی عکاسی کر سکے اور وہ ایسا نہیں کر سکتی تو ہمیشہ غریب الوطن رہے گی۔'' [1]

انشائیہ میں عصری آگہی اپنے تصور کو غیر متحرک طور پر پیش نہیں کرتی ہے بلکہ اس کی اساس بھی ہمیشہ گردش میں رہتی ہے۔ انشائیہ نگار اپنی ذات کے کسی ایک پہلو کا ذکر کرتے ہوئے زمانے کو گرفت میں لے لیتا ہے اور کبھی زمانے کے حوالے سے اپنی ذات پر وار کرتا ہے، دونوں صورتوں میں انشائیہ نگار کسی تیز ردعمل کا اظہار نہیں کرتا بلکہ زمانے کے پوشیدہ پہلوؤں کو اجاگر کرنے کے لئے اپنی شخصیت کے پوشیدہ پہلوؤں کو آشکار کرتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں ہم اس طرح بیان کر سکتے ہیں کہ انشائیہ نگار معاشرے کی تمام سرگرمیوں کی حرکات کو اپنی نظروں کے سامنے رکھتا ہے اور اس کی ہر حرکات کو بڑے ہی لطیف اور شگفتہ انداز میں اپنے دامن میں سمیٹ لیتا ہے۔ اس طرح انشائیہ نگار کی تحریر میں جو عکس ابھرتا ہے اس میں زمانے کی سرگرمیاں موجود ہوتی ہیں۔ اس ضمن میں جمیل آذر نے اپنی رائے یوں رکھی ہے:

''انشائیہ اردو ادب کی نوخیز صنف ہے اس میں تنقید حیات بھی ہے اور تہذیب حیات بھی۔ یہ انفرادی سوچ کی آزادی کا مظہر ہے۔'' [2]

مندرجہ بالا اقوال کے تناظر میں یہ ظاہر ہے کہ انشائیہ میں انشائیہ نگار اپنے عہد کے اعمال وافعال سیاسی وسماجی سرگرمیوں اور تہذیبی ومعاشرتی تبدیلیوں پر ایک حساس نظر ڈالتا ہے اور عصری حقیقتوں کو نئے نئے زاویے سے منظر عام پر لاتا ہے۔

زینت ساجدہ نے اپنے انشائیوں میں زندگی کے مختلف پہلوؤں کو بطور موضوع اپنایا ہے۔ انہوں

۱۔ ڈاکٹر سلیم اختر، انشائیہ کی بنیاد، عفیف پرنٹرس، دہلی، ۲۰۱۴ء، ص ۱۹۲۔۱۹۳

۲۔ جمیل آذر، بحوالہ ڈاکٹر سلیم اختر، انشائیہ کی بنیاد، عفیف پرنٹرس، دہلی، ۲۰۱۴ء، ص ۳۴۳

نے اپنے موضوع کا سہارا لیتے ہوئے اپنے احساسات وجذبات اور مشاہدات وتجربات کو بڑے ہی شگفتہ اور لطیف انداز میں بیان کیا ہے اور زندگی میں پیش آنے والے مسائل کو بڑے ہی انوکھے انداز میں اپنے موضوع کے تحت گرفت میں لیا ہے۔مثال کے طور پر انشائیہ ''مکان بناڈالا'' کا یہ اقتباس پیش ہے:

> ''لیکن اصل مصیبت کا سامنا اس وقت ہوا جب اس طبقے سے واسطہ پڑا جسے مزدور کہتے ہیں۔ہم نے ادب میں ہمیشہ ان کے بھولے پن، سادہ لوحی، سچائی اور نیکی کا حال پڑھا تھا کہ وہ لوگ کتنے برے ہیں جوان بیچاروں کے ساتھ برائی کرتے ہیں اس لئے طے کرلیا تھا کہ ہم اس مظلوم اور مجبور طبقے پر جبر بالکل نہیں کریں گے،۔۔۔۔۔۔انہوں نے ہماری حماقت کوشاید تاڑ لیا۔اب حال یہ ہے کہ مستری آتا ہے تو وڈّر غائب، مزدوروں کا حال یہ ہے کہ کبھی برادری میں شادی ہے۔کبھی سالے کے بہنوئی کا خالہ زاد بھائی مرگیا ہے، کبھی پنچایت کا بہانہ۔۔۔۔اکثر ہوتا یہ ہے کہ تپتی دھوپ میں سب غائب ہیں اور صرف واحد ہم حاضر۔جھنجلا رہے ہیں، بل کھا رہے ہیں، غصہ پی رہے ہیں کلیجہ چھلنی ہوا جاتا ہے۔''[1]

مذکورہ بالا اقتباس میں انشائیہ نگار نے مکان تعمیر کے دوران درپیش مسائل کا ذکر بڑے ہی جداگانہ انداز میں کیا ہے اور موضوع کے تحت انہوں نے مقام تعمیر کرنے والے مزدوروں کے رویے کو بیان کیا ہے۔

انشائیہ نگار کے لئے موضوع کی کوئی قید نہیں ہوتی ہے۔وہ اپنے عہد کی سماجی، سیاسی و مذہبی اور اخلاقی رکاوٹوں پر بھی گہری نظر رکھتا ہے۔زینت ساجدہ کے انشائیوں میں بھی سماجی سیاسی و مذہبی پہلو نظر آتے ہیں۔مثال کے طور پر انشائیہ ''اگر میں مرد ہوتی'' کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو جس میں انشائیہ نگار نے تانیثیت کے تصور کو اجاگر کرتے ہوئے اپنے جذبات کو بڑی ہی سنجیدگی کے ساتھ پیش کیا ہے:

> ''جب مرد اور عورت دونوں ہی خدا کی مخلوق ہیں، جب دونوں ہی مل کر اس دنیا کے خرابے کو آباد کرتے ہیں تو پھر زندگی ایک کیلئے محدود اور دوسرے کے لیے

[1] مکان بناڈالا، اسلوب بیان اور، اردو مجلس، حیدرآباد، ۲۰۰۹ء، ص ۴۶

لامحدود کیوں؟ ازل سے عورت یہی سوال کرتی آئی ہے اور کرتی رہے گی کبھی ہنس کر کبھی روکر۔'' ۱

مندرجہ بالا اقتباس میں فلسفہ تانیثیت کی جھلک نظر آتی ہے جس میں انشائیہ نگار نے ایک عورت کے جذبات کو پیش کیا ہے جو سماج کے مساوی حقوق کے لئے سفارش کرتی نظر آ رہی ہے۔ مذکورہ سطور کو پڑھنے کے بعد قاری کا ذہن مساوی حقوق پر غور وفکر کرنے کے لئے آمادہ ہوجاتا ہے اور یہ انشائیہ کی ایک صفت ہے جو زینت ساجدہ کے انشائیہ میں بھی دیکھنے کو ملتی ہے۔

انشائیہ میں انشائیہ نگار موضوع کے حوالے سے اپنے احساسات وجذبات کو اس طرح بیان کرتا ہے کہ آپ بیتی جگ بیتی بن جاتی ہے یعنی انشائیہ نگار کا ذاتی مشاہدہ کائنات کے مشاہدے کی صورت اختیار کرلیتا ہے۔ زینت ساجدہ کے انشائیے احساسات وجذبات سے پوری طرح مزین نظر آتے ہیں۔ انہوں نے اپنی ذاتی شخصیت کا سہارا لے کر اپنے احساسات وجذبات کو اپنے انشائیوں میں جگہ دی ہے۔ مثال کے طور پر ''اگر اللہ میاں عورت ہوتے'' کا ایک اقتباس پیش ہے:

''درد کی شدت سے میں گھبرا گئی۔ ہاتھ پاؤں سرد ہوگئے۔ ہلنے جلنے کی سکت نہ رہی کیا عورت ہونا بھی گناہ ہے۔ سارے جہاں کے دکھ درد اور عجیب وغریب کمزوریاں ورثے میں ملتی ہیں۔ صرف عورت ہی عورت کے دکھ جان سکتی ہے اور ہمدردی کرسکتی ہے۔ اے اللہ! کاش تو عورت ہوتا۔'' ۲

مذکورہ اقتباس میں زینت ساجدہ نے اپنی ذات کے حوالے سے اپنے احساسات وجذبات کو فلسفیانہ انداز میں بیان کیا ہے اور یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ عورت کو دنیا میں بہت درد والم کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اسی رنج والم کی کیفیت کو موضوع بناتے ہوئے انہوں نے اپنے اس انشائیہ میں بہت ساری ضمنی باتوں کو مربوط کیا ہے اور اپنے جذبات واحساسات کی عکاسی کی ہے۔

انشائیہ میں انشائیہ نگار اپنے ذاتی مشاہدوں وتجربوں کے ذریعے بہت سارے سماجی نظریات و

۱۔ اگر میں مرد ہوتی، اسلوب بیان اور، اردو مجلس، حیدرآباد، ۲۰۰۹ء، ص ۸۸

۲۔ اگر اللہ میاں عورت ہوتے، اسلوب بیان اور، اردو مجلس، حیدرآباد، ۲۰۰۹ء، ص ۱۷

روایات کو بھی اپنے موضوع کے تحت اپناتا ہے۔ وہ یا تو ان نظریات و روایات کو طنز و مزاح کی صورت میں پیش کرتا ہے یا اصلاح کی غرض سے قاری کی نذر کرتا ہے۔ زینت ساجدہ نے بھی اپنے انشائیوں میں بہت ساری سماجی فرسودہ روایات کو اپنے قلم کی گرفت میں لیا ہے اور معمولی سے معمولی چیزوں کو اپنے انشائیوں کا موضوع بناتے ہوئے ایک انوکھے اسلوب میں پیش کیا ہے جس سے پڑھنے والوں کو غور و فکر کی اک نئی راہ مل جاتی ہے۔ مثال کے طور پر انشائیہ ''رہیے اب ایسی جگہ چل کر'' میں انشائیہ نگار نے سماج میں رائج روایات کو بہت ہی بے باکانہ انداز میں بیان کیا ہے۔ اقتباس پیش ہے:

> ''یہاں ہر بات اور ہر کام سے پہلے ہزار بار سوچنا پڑتا ہے۔ خرچ کم کریں تو کنجوس کہلائے جائیں گے۔ سادہ کپڑا پہنے تو ذلیل سمجھے جائیں گے۔ نوکروں کی تعداد زیادہ نہ ہو تو مفلسی کا الزام دھرا جائے گا۔ خاطر تواضع نہ کیجئے تو بد تہذیب کہلائے جائیں گے۔ فیشن نہ کریں تو جاہل گنے جائیں گے۔ اور آخر چل کر یہی نتیجہ نکلا کہ تنہائی اور سکون یہاں بھی نصیب نہیں اور حالات پہلے سے زیادہ خطرناک ہیں۔'' [۱]

انشائیہ کا مقصد معلومات فراہم کرنا نہیں ہے بلکہ موضوع کے حوالے سے انشائیہ نگار قاری کو لطف اندوز کرنے کے لئے بہت ساری ایسی ضمنی بات کہہ جاتا ہے جس کی کوئی بنیادی حقیقت نہیں ہوتی ہے اور عام سے عام بات کو وہ اپنی شخصیت کے تناظر میں پیش کرتا ہے۔ زینت ساجدہ نے بھی اپنے انشائیوں میں زندگی کی تلخیوں کو عام واقعہ سے مربوط کرتے ہوئے پائے تکمیل تک پہنچایا ہے۔ مثال کے طور پر ''چلی گئی گرمی ۔۔۔ جب بیلا پھول آدھی رات'' میں انہوں نے گرمی کے موسم کو موضوع بناتے ہوئے اپنے مشاہدے کو خوبصورت انداز میں بیان کیا ہے:

> ''اس موسم کا فائدہ سب سے زیادہ بچوں کو پہنچتا ہے۔ ادھر گرمی شروع ہوئی اور ادھر اسکول بند، چلیے پڑھنے پڑھانے سے چھٹی ملی۔ لاکھ سمجھائے کہ گرمی کی دوپہر میں سونا چاہیے۔ دھوپ میں گھومنے سے لو لگتی ہے، چھٹیوں کو غنیمت سمجھ کر

۱۔ رہیے اب ایسی جگہ چل کر، اسلوب بیان اور، اردو مجلس، حیدرآباد، ۲۰۰۹ء، ص ۵۳

کچھ پڑھ پڑھالولیکن وہ بھلاکس کی مانتے ہیں۔ادھر بڑے بوڑھوں کی آنکھ بچی اور ادھر غائب۔غلیل چلانے، چڑیاں پھنسانے اور گرگٹوں کا شکار کرنے کا بہترین سیزن یہی ہے۔یہی نہیں قلفی ملائی اور آئس فروٹ والے کی صدائیں بھی باہر کی طرف دامن دل کھینچتی ہیں۔'' ۱؎

اس سلسلے میں انشائیہ ''رہیے اب ایسی جگہ چل کر'' سے ایک اقتباس پیش ہے جس میں انشائیہ نگار نے اپنے ذاتی تجربات کو بیان کیا ہے:

''یہاں کوئی چیز اپنی نہیں سارے محلے کی ملکیت ہے۔برتن، رسالے،قلم دوات، زیور، کپڑے، کرسیاں،صوفے، پلنگ حتیٰ کہ جھاڑو تک اس گھر سے اس گھر منتقل ہوا کرتی ہے۔نہ دو تو عقل کھرے، بد دماغ، کنجوس، جانے کیا کیا اور دو تو پھر بخش دو۔اگر کوئی چیز واپس ہوئی بھی تو حلیہ بگڑا ہوا، ایسا کہ پولیس بھی نہ پہچان سکے۔آپ کو اگر باغبانی، مرغبانی، بیابانی کا شوق ہو تو وہ غارت۔اونچی آواز میں میاں بیوی لڑ نہیں سکتے کہ پڑوس والے سن لیں گے۔چھوٹی موٹی دعوت نہیں کرسکتے کی سب کو خبر ہو جائے گی کس کو بلائیں اور کس کو نہ بلائیں۔'' ۲؎

انشائیہ نگاری میں موضوع کے حوالے سے زندگی کی تنقید بھی کی جاتی ہے اور تہذیبی تنقید کو بھی اپنایا جاتا ہے یعنی کہ انشائیہ نگار انسانی زندگی اور تہذیب کی تنقید بہت ہی ہلکے پھلکے انداز میں کرتا ہے تا کہ پڑھنے والوں کو مسرت حاصل ہو سکے۔زینت ساجدہ کے انشائیہ بھی تنقید حیات اور تہذیب حیات سے پُر نظر آتے ہیں۔مثال کے طور پر ''ہم ہیں تو راہ میں ہیں سنگِ گراں اور'' میں انشائیہ نگار نے عورتوں کی زندگی کو تنقیدی نقطہ نظر سے دیکھا ہے۔اقتباس ملاحظہ ہو:

''اس نے جانماز بچھائی، قبلہ کی طرف منہ کیا، سر چادر سے ڈھک لیا، صورت پر تقدس برسنے لگا اور اب خدا سے لو لگانے والی ہے۔۔۔۔وحی

۱؎ چلی گئی گرمی جب بیلا پھولے آدھی رات، اسلوب بیان اور، اردو مجلس، حیدرآباد، ۲۰۰۹ء، ص ۱۰۵

۲؎ رہیے اب ایسی جگہ چل کر، اسلوب بیان اور، اردو مجلس، حیدرآباد، ۲۰۰۹ء، ص ۵۱

اتری۔۔۔۔چنّو چھوکرے کی آواز آئی،بیگم صاحب چھوٹے بابا نے نیکر کہاں رکھے ہیں؟ بیگم صاحب نے دنیا کی طرف سے آنکھیں بند اور کان بہرے کر لیے تھے۔ممکن ہے وحی کے انتظار میں کوئی اور بات ہوتی تو سنی ان سنی کر جاتیں،لیکن یہ ہے کان چنو کی آواز کے لیئے بند نہیں ہو سکتے۔چھوٹا بچہ گیلے کپڑوں میں اپنی راگ راگنی چھیڑ دے گا،پرسوں ہی بخار سے اٹھا ہے۔آئے دن سردی کا اثر ہو جاتا ہے۔نیکر بدلنے میں دیر ہو تو ناک بہنے لگے گی،بچے نے سر اوپر کیے۔۔۔۔تو۔۔۔۔۔کہاں کی وحی کیسی عبادت۔اللہ میاں بس اب رہنے بھی دیجئے پھر کبھی فرصت سے باتیں ہوں گی۔جانماز سمیٹی چادر اتار پھینکی اور سب کچھ چھوڑ چھاڑ منے کے لئے نیکر ڈھونڈنے لگیں۔'' ۱

زینت ساجدہ کے انشائیوں میں تہذیبی وثقافتی عناصر بھی نظر آتے ہیں۔مثال کے طور پر ''چار مینار پر غلاف''اسی طرح کا ایک انشائیہ ہے۔اس انشائیہ میں انہوں نے اپنے تہذیبی وثقافتی ورثہ چار مینار کو موضوع کے تحت اپنایا ہے اور اس میں وہ چار مینار کے تحفظ کے لئے مختلف لائحہ عمل تیار کرتی ہیں۔اقتباس ملاحظہ ہو:

''بس بس چار مینار پر غلاف ضرور ہونا چاہیے۔اب ٹیکس دینے کو لوگ پیچھے ہٹیں گے تو کیوں ہٹنے لگے۔آخر آئے دن کوئی نہ کوئی ٹیکس تو لگتا ہی ہے۔جینے پر، مرنے پر،کھانے پر،ہنسنے پر رونے پر،نئے پل پر سے گزرنے کے لئے ایک پیسہ ٹیکس لگ جائے تو کون مصیبت ٹوٹ پڑے گی۔جن کے جیب میں دام نہ ہوں،وہ گھوم پھر کر دوسرے پلوں پر سے چلے جائیں گے۔پل کو مزید پھیلانے کی ضرورت نہ ہوگی۔حادثے نہ ہوں گے۔اس کے باوجود پبلک چینکھے چلاّئے تو چلانے دیجئے۔اسے تو عادت ہی ہے چلاّنے کی۔'' ۲

اسی ضمن میں ایک اور انشائیہ ''گنڈی پیٹ کا پانی'' میں حیدرآباد کی تہذیبی وثقافتی وراثت کی

۱۔ ہم ہیں تو ابھی راہ میں ہیں سنگ گراں اور،اسلوب بیان اور،اردو مجلس،حیدرآباد،۲۰۰۹ء،ص ۲۷

۲۔ چار مینار پر غلاف،اسلوب بیان اور،اردو مجلس،حیدرآباد،۲۰۰۹ء،ص ۶۱

عکاسی کی گئی ہے۔اقتباس پیش ہے:

''اس کے فائدوں پر نظر کیجیے تو بے شمار ہیں۔چائے خانوں میں چائے کی بجائے ہوٹل والے گنڈی پیٹ کا پانی پلاتے ہیں۔دودھ والے اس پانی میں دودھ ملا کر سو کے ہزار بناتے ہیں۔دواخانوں میں دوا کا نام اور اس کا کام ہوتا ہے۔سبحان اللہ! اتنے فائدے تو سمندر کے پانی کے بھی سننے میں نہیں آئے۔لیکن خدا جانے اس پانی میں کیا بات ہے جس نے یہ پانی ایک بار پی لیا اسے پھر کسی اور جگہ کا پانی موافق نہیں آیا۔باہر والوں کو تو ایک ہی دفعہ میں پانی لگ جاتا ہے۔''[1]

انشائیہ میں انشائیہ نگار اپنی ذات کو منکشف کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے زمانے کو بھی نظرانداز نہیں کرتا بلکہ زمانے میں ہورہی تبدیلیوں کو بھی اجاگر کرتا ہے یعنی انشائیہ نگار کے اندر عصری آگہی موجود ہوتی ہے جو وہ اپنی ذات کے انکشاف کے وقت زمانے کو بھی اپنی گرفت میں لے لیتا ہے اور معاشرے کی سرگرمیوں کو بھی پیش کرتا ہے۔زینت ساجدہ ایک ایسی ہی انشائیہ نگار ہیں جو حالات حاضرہ پر گہری نظر رکھتی تھیں۔انہوں نے زمانے کی سرگرمیوں اور حرکات وسکنات کا بڑی گہرائی کے ساتھ مشاہدہ کیا ہے جو ان کے انشائیوں میں صاف طور پر نظر آتا ہے۔مثال کے طور پر انشائیہ ''دیکھا دیکھی'' میں انشائیہ نگار نے اپنے مشاہدات کے ذریعے زمانے کی ایک تصویر پیش کی ہے۔مثلاً اقتباس ملاحظہ ہو:

''خواہ ملک ہو کہ قومیں، مرد ہوں کہ عورت، بوڑھے ہوں کہ بچے کسی نہ کسی طرح فیشن زدہ نظر آئیں گے۔ہم نے ہر چیز کے جتنے فیشن بدلتے دیکھے اس سے یہی اندازہ ہوا کہ فیشن ضرورت کے لیے ایجاد ہوتا ہے لیکن بعد میں اس کی ضرورت پہچانی نہیں جاتی۔دیکھا دیکھی سب ہی کرنے لگتے ہیں۔وبا جس تیزی سے پھیلتی ہے اسی تیزی سے ختم بھی ہوجاتی ہے۔حتیٰ کہ پھر ایک نئی لہر اٹھتی ہے اور سب اس کی طرف دوڑ پڑتے ہیں۔کل تک جو بات اچھی سمجھی جاتی تھی اس میں سو عیب نکل آتے ہیں یہی نہیں کسی غافل کو فیشن کے جانے کی خبر نہیں ہوئی تو لوگ اس پر

[1] گنڈی پیٹ کا پانی، اسلوب بیان اور، اردو مجلس، حیدرآباد، ۲۰۰۹ء، ص ۵۵

ہنستے ہیں، اس کا مذاق اڑاتے ہیں۔'' [1]

مندرجہ بالا مثالوں سے یہ بات واضح ہوتا ہے کہ زینت ساجدہ اپنے عہد کے اعمال و افعال، سیاسی و سماجی، تہذیبی و معاشرتی تبدیلیوں پر ایک گہری نظر رکھتی ہیں۔ وہ زندگی کے ہر پہلو کو نئے سرے سے دیکھنے کے لئے اس کے اندر غوطہ زن ہو جاتی ہیں۔ زینت ساجدہ نے اپنے انشائیوں کے لئے ہر طرح کے موضوعات کا انتخاب کر کے عام سے عام اور چھوٹی سے چھوٹی باتوں کو بھی اپنے موضوع کے تحت پیش کیا ہے۔ بات سے بات پیدا کرتے ہوئے وہ زندگی کے مختلف گوشوں کو بے نقاب کرتی ہیں۔ انہوں نے سماجی، سیاسی، معاشرتی، تہذیبی و ثقافتی غرض کہ ہر موضوع کو اپنے انشائیوں میں جگہ دی ہے جو ان کے ایک بہتر انشائیہ نگار ہونے کی ضمانت دیتا ہے۔

اپنے تجربات و مشاہدات میں قاری کو شریک کرنا

انشائیہ میں انشائیہ نگار منتخب موضوع کا سہارا لے کر زندگی کے مختلف پہلوؤں کو بے نقاب کرتا ہے اور اپنی ذات کی تشہیر کے لئے وہ اپنے تجربات و مشاہدات کو ایک نئی فکر کے ساتھ بیان کرتا ہے جس سے وہ قاری کو اپنے تجربات و مشاہدات میں شریک بنا سکے۔ انشائیہ میں غیر رسمی طریق کار کی بدولت قاری کو لطف و مسرت پہنچانا ہوتا ہے اس لئے انشائیہ نگار تجربات و مشاہدات کو مختلف رنگوں میں ڈھال کر بیان کرتا ہے جسے ہم انشائیہ نگار کی ذہنی ترنگ بھی کہہ سکتے ہیں اور یہی رنگینی قاری کی دلچسپی کا سبب بنتی ہے۔ اس سلسلے میں احمد ندیم قاسمی کی یہ رائے ملاحظہ ہو:

> ''انشائیہ کے لیے موضوع کی کوئی قید نہیں ہوتی ہے۔ اپنی ذات کے بارے میں لکھیے، کائنات کے بارے میں لکھیے، کسی ایک نکتے پر زور دیجئے یا بہت سے نکات کو باہم مربوط کر دیجئے۔ آپ جو چاہیں کیجیے۔ یعنی اپنے خیالوں، جذبوں، تجربوں اور مشاہدوں کے ساتھ کھل کر کھیلیے۔'' [2]

احمد ندیم قاسمی کی رائے میں اگر محمد سہیل عمر کی رائے شامل کر لی جائے تو انشائیہ میں تجربات و

---

[1] دیکھا دیکھی، اسلوب بیان اور، اردو مجلس، حیدرآباد، ۲۰۰۹ء، ص ۷۶

[2] احمد ندیم قاسمی، بحوالہ ڈاکٹر سلیم اختر، انشائیہ کی بنیاد، عفیف پرنٹرس، دہلی، ۲۰۱۴ء، ص ۲۸۸

مشاہدات کی اہمیت کا اندازہ باآسانی لگایا جاسکتا ہے:

> ''انشائیے میں انشائیہ نگار موضوع کے حوالے سے اپنے تجربات، احساسات، خیالات اور جذبات کو اس طرح سموتا ہے کہ وہ اس کے داخل کے ترجمان ہونے کے ساتھ ساتھ خارج کے نمائندے بھی بن جاتے ہیں۔'' ۱؎

انشائیے کے موضوع میں تجربات و مشاہدات پر تبصرہ کرتے ہوئے اردو ایسّیز کے مرتب ڈاکٹر سید ظہیر الدّین نے اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ انشائیہ نگار اپنے ذاتی تجربہ اور مشاہدہ کی بنیاد پر زندگی کے کسی بھی پہلو پر روشنی ڈال سکتا ہے اور ان تجربات و مشاہدات کو بیان کرتے وقت تحریر میں شوخی اور رمز و کنایہ کو استعمال میں لاتا ہے اور یہی شوخی تحریر اور لطیف انداز بیان قاری کو متاثر کرتے ہیں۔ان کا قول یوں ہے:

> ''ایسّے نگار اپنے ذاتی تجربوں اور مشاہدوں کی روشنی میں حیات و ممات اور حوادث کائنات سے متعلق شوخی بیان کے ساتھ بعض اوقات صاف صاف اور بعض اوقات رمز و کنایہ میں کسی اخلاقی پہلو کو پیش کرتا ہے۔۔۔۔ایسّے نگار کی کامیابی کا گرُ اس میں مضمر ہوتا ہے کہ وہ پند و نصیحت، طنز و مزاح اور زبان و بیان کو کام میں لاتا ہے۔'' ۲؎

مذکورہ بالا اقتباسات کی روشنی میں یہ واضح ہے کہ انشائیہ میں موضوع کے حوالے سے انشائیہ نگار احساسات و جذبات کو نئی طرز فکر میں بیان کرتا ہے اور اس میں وہ قاری کو برابر کا شریک بنانے کے لئے لطیف اور شگفتہ اسلوب کو استعمال میں لاتا ہے جو قاری کی دلچسپی کو ضائع نہیں ہونے دیتا اور انشائیہ کو کامیاب بنانے میں معاون ثابت ہوتا ہے۔

زینت ساجدہ کے انشائیے بھی جذبات و احساسات اور مشاہدات تجربات سے مزین نظر آتے ہیں۔انہوں نے موضوع کا سہارا لے کر زندگی کے حقائق کو اپنے تجربات و مشاہدات کی روشنی میں منظر عام

۱؎ محمد سہیل عمر،بحوالہ ڈاکٹر سلیم اختر،انشائیہ کی بنیاد،عفیف پرنٹرس،دہلی،۲۰۱۴ء،ص ۸۸۲

۲؎ اردو ایسّیز،بحوالہ ڈاکٹر سلیم اختر،انشائیہ کی بنیاد،عفیف پرنٹرس،دہلی،۲۰۱۴ء،ص ۱۹۱

پر لانے کی کوشش کی ہے۔ان تجربات و مشاہدات کو بیان کرنے میں انھوں نے لطیف اور شگفتہ اسلوب اختیار کیا ہے جس کی مدد وہ قاری کو اپنے تجربات و مشاہدات میں شریک کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔مثال کے طور پر انشائیہ ''رہیے اب ایسی جگہ چل کر'' کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

''ادھر کوئی چیز رکھی ادھر غائب،جوتے نالیوں میں،کتابیں باورچی خانہ میں،میلے کپڑے دیوان خانے میں نظر آتے ہیں۔کوئی پلنگوں پر اچھل کود کی مشق کر رہا ہے۔کوئی چھت پر چڑھا منڈیر پر سے جھانک رہا ہے۔کسی نے فرش پر دوات الٹ دی اور بیٹھا اپنا منہ پوت رہا ہے۔ان کے والدین سے شکایت کیجیے تو بچوں کی معصومیت اور ہماری سخت دلی پر لیکچر جھاڑا جاتا ہے،خدا اور رسول کا واسطہ الگ۔ضروری کاغذ اور خطوط آئے دن غائب ہوا کرتے ہیں۔سارا گھر چھان ماری ایک ہی پتہ نہیں چلتا۔زمین نگل گئی یا آسمان کھا گیا۔'' [۱]

مذکورہ اقتباس میں انشائیہ نگار نے اپنے تجربات کی روشنی میں پڑوسیوں کے اپنے ساتھ تعلقات اور معاملات کو بیان کیا ہے۔وہ پڑوسیوں کے اعمال و افعال کو لطیف اور انوکھے انداز میں منعکس کرتے ہوئے قاری کو اپنے تجربات میں شریک کرتی نظر آتی ہیں۔

انشائیہ ''خالہ ماں سلام'' عنوان کے تحت انہوں نے سماجی معاملات کو بہترین انداز میں پیش کیا ہے۔مثال کے طور پر ایک اقتباس پیش ہے جو ان کے سماجی تجربات کو بیان کرتا ہے:

''ایک اور دلچسپ طبقہ بھی ہمیں خالہ ماں سلام کہتا ہے اور وہ ہے بیٹی۔بیٹے والوں کا۔چھوٹے جانی وہی امام علی کے بہنوئی احمد خان کا بیٹا،اب پڑھ لکھ کر ماشااللہ نوکر ہو گیا ہے۔نسبت کی تلاش ہے لڑکی صورت شکل کی اچھی،صوم وصلوٰۃ کی پابند،خانہ داری کی ماہر،طبیعت کی نیک،کم گو،کم سخن،دولت مند اور تعلیم یافتہ ہونی چاہیے۔تم آخر اتنی لڑکیوں سے واقف ہو کسی ایک کی نشان دہی کر دو ثواب کا کام ہے،جنت میں گھر ملے گا۔شادی میں جوڑی کا جوڑا الگ۔'' [۲]

۱۔ رہیے اب ایسی جگہ چل کر،اسلوب بیان اور،اردو مجلس،حیدر آباد،۲۰۰۹ء،ص ۵۰

۲۔ خالہ ماں سلام،اسلوب بیان اور،اردو مجلس،حیدر آباد،۲۰۰۹ء،ص ۴۷

مذکورہ بالا اقتباس میں زینت ساجدہ نے سماج میں رائج شادی کے لئے تلاش نسبت کا ذکر کرتے ہوئے اپنے تجربات کو قاری کے روبرو کیا ہے اور رائج طریقہ کار کو اپنی شخصیت کے حوالے سے منظر عام پر لانے کی کوشش کی ہے۔

انشائیہ ''میں نے نوکری کی'' زینت ساجدہ کا تجربات و مشاہدات سے پُر ایک انشائیہ ہے جس میں وہ زیر ملازمت فرد کی زندگی کے پیچ وخم کو انوکھے انداز میں ذکر کرتی ہیں۔مثال کے طور پر اس انشائیہ کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو جس میں وہ ملازمت سے متعلق اپنے تجربات کو بیان کرتی ہیں:

> ''اب تو یہ حال ہے کہ سوئے نہیں اور جاگنے کی فکر سوار ہوگئی۔نفسیات کے ماہرین کا خیال ہے کہ تحت الشعور میں ہم جاگتے ہی رہتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ جب بھی آنکھ کھلے یا کھولنے پر مجبور کئے جائیں اپنے آپ کو تھکن کا شکار پاتے ہیں۔بستر چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا۔لوٹتے پوٹتے اور آہستہ آہستہ بیدار ہونے کی لذت دل کو بہکاتی رہتی ہے۔لیکن گھڑی پر نظر پڑتے ہی اوسان خطا ہو جاتے ہیں۔۔۔۔۔ناشتہ تیار ہوا تو جلدی جلدی دو نوالے حلق سے اتار لئے۔نہیں تو پھر چائے کی ایک پیالی اور روانہ شد۔'' [1]

مذکورہ اقباس میں زینت ساجدہ بحیثیت زیر ملازم نظام العمل کے متعلق اپنے تجربات کو بیان کر رہی ہیں اور مختلف سرگرمیوں کو گناتے ہوئے اپنی زندگی کے پہلوؤں کو آشکار کرتی نظر آتی ہیں۔انہوں نے اپنے ذاتی تجربوں کے ذریعے تمام زیر ملازمت افراد کی زندگی کی ترجمانی کی ہے جس کی بدولت وہ قاری کو اپنے تجربہ میں شامل کر لیتی ہیں۔

زینت ساجدہ نے نہ صرف اپنے انشائیوں میں تجربات کو بیان کیا ہے بلکہ زندگی کے مختلف پہلوؤں کو بے نقاب کرنے کے لئے اور انشائیہ میں قاری کی شمولیت کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے اپنے مشاہدات کو بھی انوکھے انداز میں بیان کیا ہے۔انہوں نے اپنے مشاہدات کے ذریعے اپنے اطراف و اکناف کے سماج اور ماحول کی بہترین عکاسی کی ہے۔وہ اپنے ذاتی مشاہدات کی بدولت کائنات کے

[1] میں نے نوکری کی، اسلوب بیان اور، اردو مجلس، حیدرآباد، ۲۰۰۹ء، ص ۸۱

مشاہدے کو بیان کرتی نظر آتی ہیں۔مثال کے طور پر انشائیہ ''رہیے اب ایسی جگہ چل کر'' کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

''عمر ایسے ہی گنجان محلوں میں گزری جہاں گھر کم آدمی زیادہ اوران سے زیادہ بچے ہوا کرتے۔صبح سے شام تک گلیاں آباد رہا کرتیں۔ہر شخص دوسرے کے دکھ درد کا شریک،رات میں بچہ معمول سے زیادہ رویا اور پڑوس سے آدمی خیریت پوچھنے آپہنچا۔کسی نے جھوٹ موٹ آواز لگائی چور چور اور سارا محلّہ ہتھیار بند گھر پر موجود۔کوئی تقریب ہوئی تو محلے کی لڑکیاں بالیاں کام کاج میں ہاتھ بٹانے آدھمکیں۔گھر میں نوکر نہیں تو پڑوسیوں کے بچوں سے کام لے لیا۔کسی کو دوا لینے دوڑایا،کسی کو مٹھائی پان لانے۔'' ۱؎

مذکورہ بالا اقتباس ایک متوسط اور گنجان آبادی والے معاشرے کی ترجمانی کرتا ہے۔انشائیہ نگار نے اپنے مشاہدے کے ذریعے اطراف واکناف کے ماحول اور پڑوسیوں کے ساتھ ربط وتعلق اور معاملات کو بیان کرتے ہوئے قاری کو اپنے مشاہدے میں شریک کرنے کی کوشش کی ہے۔

انشائیہ ''خالہ ماں سلام'' کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو جو انشائیہ نگار کے سماجی مشاہدے کو بیان کرتا ہے:

''بیوی آج کل تو دنیا اسی کی ہے۔اصل پھسل پڑے کم ذات سر چڑھے۔ہر شخص پڑھنے لکھنے پر تلا ہوا ہے،سفارشیں چلتی ہیں،رشوتیں دی جاتی ہیں،تار کھینچے جاتے ہیں تو ہم اپنوں سے کیوں نہ فائدہ اٹھائیں۔'' ۲؎

مذکورہ بالا اقتباس میں زینت ساجدہ نے اپنے عہد کے حالات پر نظر ڈالی ہے اور سماج میں رائج بری روایات اور پھیلی بدعنوانیوں کو اپنے مشاہدے کے ذریعے بیان کیا ہے۔

انشائیہ ''ہم ہیں تو ابھی راہ میں ہیں سنگِ گراں اور'' میں زینت ساجدہ نے ایک ادیب کی گھریلو

۱؎ رہیے اب ایسی جگہ چل کر،اسلوب بیان اور،اردو مجلس،حیدرآباد،۲۰۰۹ء،ص ۴۹

۲؎ خالہ ماں سلام،اسلوب بیان اور،اردو مجلس،حیدرآباد،۲۰۰۹ء،ص ۷۰

زندگی کو اپنے مشاہدات کی گرفت میں لیا ہے۔مثال کے طور پر اس انشائیہ کا ایک اقتباس پیش ہے:

''آپ کو ان باتوں پر یقین نہ آئے تو کسی بھی ایسی بیوی کے گھر چلے جائیے جو شادی سے پہلے یا بعد لکھنے پڑھنے کا دعویٰ کرتی ہو۔یہی نقشہ نظر آئے گا۔شاعر ہو تو بیاض دیکھیے۔کچھ نظمیں ہوں گی،غزلیں بھی،لیکن اس میں ساتھ ساتھ مہینے بھر کے غلّے کا حساب،دھوبی کی بے باقی،تیل کا بھاؤ،گھی کے ڈبوں کی گنتی،پاندان کا خرچ سب لکھا ہوگا۔۔۔۔۔۔ہر عورت اپنے اندر ایک فنکار رکھتی ہے۔ایسی ایک بیاض ہر ایک کے پاس ہوتی ہے۔خود شاعری نہ کرتی ہوں تب بھی کچھ نعتیہ کلام اور کچھ پسندیدہ شعر اس میں نقل ہوں گے اور اس کے ساتھ ایسے ہی حاشیے۔'' [۱]

اس اقتباس میں انشائیہ نگار نے خاتون ادیب کی گھریلو زندگی کی عکاسی کی ہے۔انہوں نے اس اقتباس کے تحت یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ عورتوں کی زندگی مختلف مسائل سے دوچار ہوتی ہے اور عورت چاہے جس بھی حیثیت کی مالک ہو اس کو گھریلو سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ دیگر سرگرمیوں کو بھی انجام دینا ہوتا ہے جو اس کی ہمہ جہت شخصیت کی ضامن ہیں۔

زینت ساجدہ نے اپنے ایک انشائیہ ''کباڑ خانے سے میوزیم تک'' میں ایک عہدہ دار فرد کی ملازمت سے فراغت کے بعد کی زندگی کو اپنے مشاہدے کے ذریعے گرفت میں لیتے ہوئے ان کے منصبی لالچ کو بہت ہی انوکھے اور دلچسپ انداز میں بیان کیا ہے۔اس انشائیے کا ایک اقتباس پیش ہے:

''60 برس کی عمر میں قید ملازمت سے رہائی پا کر نکلتے ہیں تو نیم سرکاری اداروں میں پانچ دس سال مال بنا لیتے ہیں۔وہاں سے الگ ہوتے ہیں تو ادبی اور تہذیبی انجمنوں کے تنخواہ باب سرپرست بن بیٹھتے ہیں۔چنانچہ ستر سے سو تک ان کی قدر و قیمت میں مسلسل اضافہ ہوتا رہتا ہے اور سنچری پار کر لینے کے بعد تو بس تبرک کی طرح کئی اداروں اور کمیٹیوں میں بٹ جاتے ہیں۔'' [۲]

---

[۱] ہم ہیں تو ابھی راہ میں ہیں سنگ گراں اور، اسلوب بیان اور، اردو مجلس، حیدرآباد، ۲۰۰۹ء، ص ۲۹

[۲] کباڑ خانے سے میوزیم تک، اسلوب بیان اور، اردو مجلس، حیدرآباد، ۲۰۰۹ء، ص ۹۵

مذکورہ بالا اقتباس میں زینت ساجدہ نے ملازمت سے سبکدوش ہوئے فرد کی منصب اور مال وزر کے تئیں لالچ کا ذکر کرتے ہوئے طنز کسا ہے اور ایسے افراد کی بڑھتی عمر کے ساتھ ساتھ ان کی بڑھتی ہوئی عظمت اور دیگر اضافی سرگرمیوں کو بھی بیان کیا ہے جس کی بدولت وہ اپنے مشاہدے میں قاری کی شمولیت کو یقینی بنانے میں کامیاب نظر آتی ہیں۔

قاری کو اعتماد میں لینا

دیگر اصناف ادب کے برعکس انشائیہ کا اسلوب جدا ہوتا ہے اس میں انشائیہ نگار آزادانہ طور پر قاری کو اعتماد میں لینے کے لئے ہر طرح کی بات کہنے کو آزاد ہوتا ہے۔ انشائیہ کے پہلو کسی نہ کسی صورت میں انشائیہ نگار کی ذات سے جڑے ہوتے ہیں اور انشائیہ نگار کا مقصد قاری کی اصلاح کرنا یا معلومات فراہم کرنا نہیں ہوتا ہے بلکہ براہ راست یا بالواسطہ طور پر وہ اپنی ذات کو مختلف واقعات مشاہدات و تجربات کے ذریعے آشکار کرتا ہے۔ اپنے خیالات واحساسات اور تجربات ومشاہدات کو بیان کرنے کے لئے انشائیہ نگار کو کسی بھی دلائل و براہین یا منطق کی ضرورت نہیں ہوتی بلکہ وہ قاری کو اپنا جگری دوست تصور کرتے ہوئے بے تکلفی کے ساتھ باتیں کرتا جاتا ہے۔ اپنے خیالات واحساسات اور مشاہدات وتجربات کو بیان کرنے کے لئے وہ معمولی سے معمولی باتوں کو بھی انوکھے انداز، آزادانہ اسلوب اور ہلکے پھلکے مزاح کا استعمال کرتا ہے اور یہ ساری تکنیک قاری کو اپنے اعتماد میں لینے کے لئے استعمال میں لاتا ہے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر سلیم اختر کی رائے ملاحظہ ہو:

> ”بعض اوقات طنز کی ترشی یا مزاح کی چاشنی سے ایک چیزی دیگر پیش کی جاتی ہے۔ یہ گویا قاری کو جیتنے کے لئے ایک رشوت یا چاٹ ہے اور یہ پہلو بھی نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔“ [1]

انشائیہ میں منطقیانہ استدلال کو اہم جز تسلیم نہیں کیا جاتا ہے۔ اس کے بغیر بھی انشائیہ کی تخلیق عمل میں لائی جاتی ہے۔ انشائیہ میں عدم استدلال کی بدولت انشائیہ نگار بات سے بات پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے جس سے انشائیہ میں بہت ساری ضمنی باتیں بھی سما جاتی ہیں۔ انشائیہ نگار ہلکے پھلکے طنزیہ ومزاحیہ کلمات کا

[1] ڈاکٹر سلیم اختر، انشائیہ کی بنیاد، عفیف پرنٹرس، دہلی، ۲۰۱۴ء، ص ۱۷۴

سہارا لے کر قاری کو لطف و مسرت عنایت کرتا ہے اور اپنی ذات کو بالواسطہ طور پر منکشف کرتا ہے۔اس ضمن میں ڈاکٹر سلیم اختر نے اپنی رائے یوں دی ہے:

''انشائیہ نگار نے کیوں کہ منطقیانہ استدلال کے مطابق بات نہیں کرنی اس لئے وہ بات بنانے کی خاطر بات میں سے بات پیدا کرتا جاتا ہے۔بات میں سے بات پیدا کرنا دراصل ذہن کے اس نفسیاتی عمل کے باعث ممکن ہوتا جیسے تلازم خیال کہا جاتا ہے۔یعنی دیپ سے دیپ روشن ہونے کے مانند خیال سے خیال کی لو پھوٹتی ہے اور یوں غیر محسوس طور پر بات کا دائرہ پھیلتا جاتا ہے اور یہ تمام عمل کیونکہ استدلال کی مدد کے بغیر ہوتا ہے اس لئے انشائیہ نگاری اگر کوئی استدلال بنتا ہے تو وہ صرف قاری کے لطیف احساسات سے فنکارنہ چھیڑ چھاڑ ہوتی ہے اور بس اسی کو ہم استدلال کا نام دے سکتے ہیں کی یہ انداز استدلال صرف انشائیہ ہی سے مخصوص نظر آتا ہے۔''[1]

مذکورہ بالا اقتباسات کی رو سے یہ واضح ہوتا ہے کہ انشائیہ نگار قاری کو اپنا ایک بہترین دوست سمجھتے ہوئے خوش مزاجی کی کیفیت نے اپنے احساسات و جذبات اور مشاہدات و تجربات کو بے تکلفانہ انداز میں اس کے سامنے رکھتا ہے اور اس میں انشائیہ نگار کو کسی بھی عقلی و منطقی دلیل پیش کرنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی ہے اور ساتھ ہی ساتھ قاری کو انوکھے انداز بیان کی بدولت لطیف اور خوشگوار فضا فراہم کرتا ہے جس کی بدولت وہ قاری کی ہمدردی حاصل کرتا ہے۔

زینت ساجدہ کو زبان و بیان پر دسترس حاصل ہے اور اس کے باعث وہ بڑی آسانی سے اپنے موضوع کے حوالے سے بات سے بات پیدا کرتی ہوئی معمولی سے معمولی باتوں میں بھی ایک انوکھا زاویہ ڈھونڈ لیتی ہیں جو قاری کی دلچسپی کا ذریعہ بنتا ہے۔انہوں نے اپنی شخصیت کو بالواسطہ طور پر منکشف کرنے کے لئے زندگی کے مختلف پہلوؤں کو اپنے تجربات و مشاہدات کی روشنی میں اپنے مختلف انشائیوں میں جگہ دی ہے۔وہ اپنے انوکھے انداز بیان، زبان کی تازگی اور شگفتگی، اور چیزوں کو نئے زاویہ سے دیکھنے کے اپنے فن

[1] ڈاکٹر سلیم اختر، انشائیہ کی بنیاد، عفیف پرنٹرس، دہلی، ۲۰۱۴ء، ص ۲۱۷

کی بدولت قاری کو اعتماد میں لے لیتی ہیں اور قاری کے ساتھ ایک شعوری ربط قائم کرنے میں کامیاب ہو جاتی ہیں۔مثال کے طور پر انشائیہ ''ہم ہیں تو ابھی راہ میں ہیں سنگِ گراں اور'' میں انہوں نے عورتوں کی زندگی میں درپیش مختلف مسائل کو اپنے موضوع کے حوالے سے بیان کیا ہے اور اپنے انداز بیان کی بدولت قاری کو گرفت میں لینے کی کوشش کی ہے۔مثال کے طور پر اس انشائیہ کا ایک اقتباس پیش ہے:

> ''ایک گھنٹہ بعد منہ لال بھبوکا بنائے آنکھیں ملتے میز پر افسانے کی خبر لینے پہنچے تو معلوم ہوا کہ قلم کھلا چھوڑ گئے تھے۔لاڈلی بیٹی نے اس سے زمین کھودنے کا کام لیا ہے، کیاریاں لگائی گئی تو پھول کھلیں گے، کاغذ کی منومیاں نے ناؤ بنا ڈالی تھی اور اب ہاؤس میں ترانے کے لئے جا رہے ہیں۔ان کے کان کھینچے، طمانچہ مارا، چھوکرے پر خفا ہوئے، آیا پر چیخے چلائے بچوں کو ذرا دیر کے لئے بھی سنبھالا نہیں جا سکتا اور پھر پھٹے ہوئے کاغذ کو جوڑ جوڑ کر پڑھنے لگے۔'' [1]

مندرجہ بالا اقتباس میں انشائیہ نگار نے عورتوں کی ہمہ جہت شخصیت کے پہلو کو اجاگر کیا ہے۔عورتوں کی مختلف ذمہ داریوں کو انھوں نے اپنے تجربات کے تحت سمیٹتے ہوئے قاری کو اعتماد میں لینے کی کوشش کی ہے جن میں ان کی شخصیت کے پہلو بھی بالواسطہ طور پر منکشف ہوتے ہیں۔

انشائیہ ''بی جمالو'' میں بھی زینت ساجدہ نے موضوع کے حوالے سے بات سے بات پیدا کرتے ہوئے خواتین کے عادات واطوار سے متعلق گفتگو کی ہے۔انہوں نے ایک خیالی کردار بی جمالو کے ذریعہ خواتین کی مختلف عادات واطوار اور ان کے سماجی معاملات کی لطیف انداز میں عکاسی کی ہے۔مثال کے طور پر اس انشائیہ کا ایک اقتباس پیش ہے جس میں وہ قاری کو کچھ صلاح دے رہی ہیں:

> ''مفت کا نسخہ ہے۔گھر بیٹھے چٹکی بجاتے آپ کچھ بھی لکھ لیجئے۔مستند نہ کہلائے تو ہمارا ذمہ۔اور تحقیقات ہٹ جائیں تو سرزمین ہند کے اہل علم اور محقق آپ کا دم نہ بھرنے لگے اور اخباروں اور رسالوں میں تبصرے نہ نکلے تو ہم سے پوچھیئے گا۔کیا عجب سال کی بہترین تخلیق وہی قرار دی جائے۔صوبائی حکومت آپ کا منہ

[1] ہم ہیں تو ابھی راہ میں ہیں سنگ گراں اور، اسلوب بیان اور، اردو مجلس، حیدرآباد، ۲۰۰۹ء، ص

موتیوں سے بھر دے، ساہتیہ اکاڈمی سونے میں تلوا دے، وزارت تہذیبی امور خطاب سے سرفراز کرے۔'' ۱؎

انشائیہ نگار نے بی جمالو کے کردار کا سہارا لے کر عورتوں کے مختلف ہنر کو طنزیہ انداز میں گنایا اور ان کے سماجی معاملات کو بھی بیان کیا ہے۔ مذکورہ اقتباس میں بات سے بات پیدا کرتے ہوئے انہوں نے قاری کو کسی بھی موضوع پر کچھ بھی تحریر کرنے کی صلاح پیش کی ہے جو کہ سماج میں موجودہ نااہل ادیب پر ایک طنزیہ وار ہے۔

انشائیہ ''سونا لاون پی گئے'' میں زینت ساجدہ نے سونے کے زیور کے تئیں عورتوں کی خواہشات کو بیان کیا ہے۔ انہوں نے موضوع کے حوالے سے بہت ساری ضمنی باتیں بھی بیان کی ہیں جو ان کے سماجی مشاہدات کی ترجمان ہیں۔ مثال کے طور پر اس انشائیہ کا ایک اقتباس پیش ہے:

''ذرا تصور کیجئے، آپ میاں کے ساتھ بازار جارہی ہیں کانوں میں جھمکے، ماتھے پر جھومر، چوٹی میں سونے کا تعویذ اور سر میں پھول، کمر میں بگلوس، ہاتھ میں کڑے، کنگنیاں گلے میں کانٹا ہنسلی، لاطمع، چندن ہار، ہاتھوں میں کھڑے، کنگن پہنچیاں، اوہے دیتاں، پور پور چھلے، پاؤں میں توڑے، پازیب۔ میاں کو دفتر جانا ہے یا آپ کو وقت پر کچھ پہنچنا ہے مگر ٹھک ٹھک کر چم چم کرتی چلی جارہی ہیں، دل اس فکر میں کی زیور گم نہ ہوجائے۔ اور پاؤں من من کے۔ بازار کے لوگ آپ کو کارٹون سمجھ کر دیکھنے لگیں اور میاں مارے غصہ کے پسینے پسینے ہوجائیں۔ توبہ آپ ایسا نہیں کرسکتی تو پھر یہ سب آخر کس لئے۔'' ۲؎

مذکورہ بالا اقتباس میں زینت ساجدہ نے اپنے سماجی تجربات و مشاہدات کی بدولت آرائش و زیبائش سے آراستہ خاتون کی انوکھے انداز میں عکاسی کی ہے اور قاری کو اپنے اس انوکھے اسلوب کی بدولت اپنے احباب میں شامل کرنے کی کوشش کی ہے۔

زینت ساجدہ نے غیر رسمی انداز اختیار کرتے ہوئے اپنے انشائیوں کو انوکھے اور شگفتہ

۱؎ بی جمالو، اسلوب بیان اور، اردو مجلس، حیدر آباد، ۲۰۰۹ء، ص ۳۳

۲؎ سونا لاون پی گئے، اسلوب بیان اور، اردو مجلس، حیدر آباد، ۲۰۰۹ء، ص ۱۱۴

اسلوب، ہلکے پھلکے الفاظ، اور آزادانہ خیال سے مزین کیا ہے۔انہوں نے قاری کو اپنے ایک قریبی دوست کا درجہ دیتے ہوئے اپنی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کو ان کے سامنے رکھ دیا۔انہوں نے بات سے بات پیدا کرتے ہوئے زندگی کے پوشیدہ حقائق کو معمولی سے معمولی شے میں تلاش کرنے کی کوشش کی ہے اور قاری کو اعتماد میں لیتے ہوئے لطیف اور مزاحیہ انداز میں اپنے تجربات و مشاہدات اور احساسات و تجربات کو منظر عام پر لاتی ہیں۔اسی تکنیک کی بدولت انہوں نے اپنے انشائیے کو دلچسپ اور موثر بنایا ہے جس کی بدولت قاری کو انشائیہ سے دلچسپی ضائع نہیں ہوتی اور وہ انشائیہ نگار کا ہمدرد بن کر انشائیہ کو پڑھتا جاتا ہے۔

دعوت غور وفکر

انشائیہ کی ہیت دیگر اصناف ادب کے برعکس زیادہ لچیلی ہوتی ہے۔اس میں انشائیہ نگار کو تمام قسم کی باتوں کو بیان کرنے کی آزادی حاصل ہے۔انشائیہ کے مقاصد دیگر اصناف ادب سے جدا ہیں۔انشائیہ نگار کا مقصد قاری کو مضمون کی طرح معلومات پہنچانا یا اصلاح کرنا نہیں ہوتا بلکہ غیر رسمی انداز، شگفتہ اسلوب اور معمولی باتوں میں نیا پن پیدا کرتے ہوئے لطف و مسرت فراہم کرنا ہوتا ہے۔انشائیہ نگار موضوع کا سہارا لے کر بات سے بات پیدا کرتے ہوئے بہت ساری باتیں بھی بیان کرتا ہے اور زندگی سے متعلق غیر معمولی اور پوشیدہ پہلوؤں کو نئے زاویے سے دیکھتا ہے اور اس میں ایسا نقطہ پیدا کرتا ہے جس سے قاری کا ذہن غور وفکر کی طرح راغب ہو جاتا ہے۔اس دعوت وفکر کا کام انشائیہ نگار قاری کو اعتماد میں لیتے ہوئے بہت احتیاط سے انجام دیتا ہے تاکہ قاری کے ذہن پر گراں نہ گزرے۔اس سلسلے میں ڈاکٹر سلیم اختر کی یہ رائے پیش ہے:

> ’’انشائیہ نگار معلم کی مانند تعلیم نہیں دیتا اور نہ سائنسداں کی مانند نا معلوم سے معلوم کی طرف لے جاتا ہے۔وہ صرف نئے زاویوں سے کام لے کر غمزہ غماز سے چونکانے کی کوشش کرتا ہے۔وہ جھنجھوڑتا نہیں بلکہ سرگوشی کرتا ہے اس لئے گراں گوش قاری پر اس کا اثر نہیں ہوتا اور اسی لئے مہذب ذہن کے شرط عائد کی تھی۔‘‘[1]

[1] ڈاکٹر سلیم اختر، انشائیہ کی بنیاد، عفیف پرنٹرس، دہلی، ۲۰۱۴ء، ص ۲۲۱

انشائیہ نگار کا مقصد زندگی کے مختلف پہلوؤں میں پوشیدہ حقائق کو ایک نئی فکر کے ساتھ منظر عام پر لانا ہے تاکہ قاری کے ذہن کو اسی وقت سے ایک نئی فکر اور تازگی کا احساس ہو اور وہ اپنے ذہن کو غور وفکر کی طرف راغب کر سکے۔ اس ضمن میں وزیر آغا کا بھی یہ قول ملاحظہ ہو:

''انشائیہ نگار وہ شخص ہے جو آپ کو اپنی گفتگو اور لہجے سے مسخر کر لیتا ہے لیکن جس کا اصل مقصد یہ ہے کہ وہ انسانی زندگی کے کسی چھپے ہوئے پہلو کو اس انداز سے سامنے لائیے کی آپ کو ایک خوشگوار سے جھٹکے کا احساس ہو اور آپ نا معلوم ہی اندر جست لگانے کے لئے ذہنی طور پر تیار ہو جائیں۔''[1]

مذکورہ بالا اقتباس کی رو سے یہ واضح ہے کہ انشائیہ نگار اپنے سہولت اسلوب کا سہارا لیتے ہوئے زندگی کے مختلف چھپے ہوئے پہلوؤں کو ایک نئی فکر کے ساتھ منظر عام پر لاتا ہے اور قاری کو جھنجھوڑنے کی کوشش کرتا ہے۔

زینت ساجدہ کے انشائیوں میں بھی وہ انوکھا پن اور انشائی فکر موجود ہیں جو قاری کو غور وفکر کی ترغیب دیتی ہے۔ انہوں نے اپنے موضوع کے ذریعے غیر معمولی باتوں سے زندگی کی حقیقتوں کو سامنے لاتے ہوئے اس میں ایک نئی فکر پیدا کرنے کی کوشش کی ہے جس سے قاری کی توجہ انشائیہ میں قائم رہتی ہے۔ وہ بات سے بات پیدا کرتے ہوئے بہت ہی محتاط انداز میں قاری کو غور وفکر کی دعوت دیتی ہیں۔

انشائیہ ''اگر اللہ میاں عورت ہوتے'' کا ایک اقتباس پیش ہے جس میں وہ موضوع کے حوالے سے عورتوں کے مسائل پر گفتگو کرتی نظر آتی ہیں اور انسانی اقدار کے فقدان کو نظر میں رکھتے ہوئے اس پر اپنی بے بسی بھی ظاہر کی ہے۔ مثال کے طور پر اس انشائیہ کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

''میرے اللہ تو سچ سچ بتا دے۔ مجھ سے اپنا کہہ دے کہ تو مرد نہیں۔ ہرگز نہیں۔ جو دولت کے لئے لڑتا ہے، زمین کے لئے لڑتا ہے لیکن انسانیت کے لئے نہیں لڑتا، انسانیت کے دشمنوں سے نہیں لڑتا، نفرت، گناہ اور دل آزاری سے نہیں لڑتا، اگر تو مجھے راز ہی میں کہہ دے تو میں وہ تمام باتیں تجھ سے کہہ دوں جو کسی

[1] وزیر آغا، انشائیہ کے خدوخال، لبرٹی آرٹس پریس، دہلی، ۱۹۹۱ء، ص ۲۰

سے نہیں کہیں۔ وہ سب کچھ تجھ سے مانگ لو جواب تک تجھ سے نہ مانگ سکی۔ مگر نہیں، کون سمجھائے گا۔ کسی نے سوچا ہی نہیں۔'' ۱؎

مذکورہ بالا اقتباس میں انشائیہ نگار نے خدا کو مخاطب کرتے ہوئے انسانوں کے بگڑے حالات اور گرتے اقدار کو بیان کیا ہے۔ انہوں نے قاری کے ذہن کو انسانی اقدار کے فقدان پر غور و فکر کرنے کی دعوت دی ہے جس سے انسانی اقدار کا تحفظ کیا جاسکے اور انسانیت کے جذبے کو فروغ مل سکے۔

انشائیہ ''ہم ہیں تو ابھی راہ میں ہیں سنگِ گراں اور'' کے عنوان کے تحت زینت ساجدہ نے عورتوں کی پیچیدہ زندگی اور ان کی مختلف سرگرمیوں کو موضوع بناتے ہوئے مردوں کے کردار اور ان کی ذمہ داریوں کو بھی اجاگر کیا ہے۔ مثال کے طور پر اقتباس دیکھئے:

''مگر آپ کہیں گے کہ مرد کی زندگی پر بھی اوروں کا حق ہے۔ وہ بھی گھر گرہستی میں برابر کا حصہ دار ہے، بلکہ زیادہ بوجھ وہی اٹھاتا ہے۔ کمائے وہ، جان کھپائے وہ، عورت کو مزے سے گھر میں بیٹھنے اور بناؤ سنگھار سے فرصت نہیں، اور فرصت ملے تو میاں سے چھیڑ- چھاڑ، پڑوسنوں کا جھگڑا، ساس نندوں کی نوک جھوک، بچوں کی مار پٹائی۔ ٹھیک ہے۔ وہ بھی سچ یہ بھی سچ، مگر سوچئے تو غریب اور کیا کرے، اپنی جھنجھلاہٹ کا اظہار کیسے ہو۔'' ۲؎

انشائیہ ''چلی گئی گرمی جب بیلا پھول آدھی رات'' میں انشائیہ نگار نے گرمی کے موسم کو موضوع بناتے ہوئے اس کی بہت ساری افادیت کو بیان کیا ہے۔ انہوں نے موضوع کے حوالے بہت ساری ضمنی باتوں کو پیش کرتے ہوئے غور و فکر کا نقطہ بھی فراہم کیا ہے۔ مثال کے طور پر یہ اقتباس پیش ہے:

''بھائی سچ پوچھیے تو اس موسم میں ہر ایک کے لئے راحت ہی راحت ہے مفت میں ثواب کمانے اور عاقبت سنوارنے کا شوق ہو تو بسم اللہ یہ شوق بھی پورا کر لیجئے۔ محنت اور روپیہ بھی کوئی زیادہ درکار نہیں۔ دو چار مٹی کے گھڑے، ایک آدھ آنجورہ خرید لیا اور سبیل لگا بیٹھے۔ راہ چلتوں کو پانی پلایئے اور اعمال نامے میں

۱؎ اگر اللہ میاں عورت ہوتے، اسلوب بیان اور، اردو مجلس، حیدرآباد، ۲۰۰۹ء، ص ۲۴

۲؎ ہم ہیں تو ابھی راہ میں ہیں سنگ گراں اور، اسلوب بیان اور، اردو مجلس، حیدرآباد، ۲۰۰۹ء، ص ۲۷

ٹھنڈے محل لکھوائیے۔ ہینگ لگے نہ پھٹکری رنگ چوکھا آئے گا۔'' ۱؎

مذکورہ اقتباس میں انشائیہ نگار نے گرمی کے موسم اوراس کی افادیت پر گفتگو کرتے ہوئے قاری کو غور وفکر کی آزادی بھی مہیا کیا ہے۔اس اقتباس میں انھوں نے قاری کو مفت میں ثواب کمانے اور نیک اعمال کرنے کی دعوت دی ہے جو دنیاوی زندگی اورآخری زندگی کے لیے فائدہ مند ثابت ہوگا۔

انشائیہ ''اگر میں مرد ہوتی'' میں زینت ساجدہ نے مردوں کے منفی کردار کی لطیف اورمزاحیہ انداز میں عکاسی کی ہے۔انہوں نے اپنی ذات کا سہارا لے کر مردوں کی کمزوریوں اور برے اعمال کومنکشف کیا ہےاوران کوجھنجھوڑتے ہوئےغوروفکر کی راہ فراہم کی۔مثال کےطور پر یہ اقتباس دیکھئے:

''چلواچھا ہوا کہ مرد نہ ہوئی۔ورنہ خاص بن کوڑی کا تماشا ہوتا۔اپنےنفس کا غلام ہوتا مگر آزاد خیال ظاہر کرتا۔غنڈا شہدا بنا پھرتا اوراپنے کو جواں مرد سمجھتا۔آوارہ گردی کرتا اور خودداری کا رونا روتا۔ایک پمفلٹ پڑھ کراپنے کوانقلابی کہلوانا پسند کرتا۔بڑی مشکلوں سے برسوں گنوا کرامتحان دیتااورامتحان گاہ سے باہر نکل کر علم کودل ودماغ سے محو کر دیتا۔بے کارادھرادھر مارا پھرتا اوراپنے کوقوم کا خادم ،وطن کا سپوت اورملک کا جانثار کہتا۔'' ۲؎

اس اقتباس میں انھوں نے مردوں کی خواہشات اور برے اعمال پرطنزیہ انداز میں وار کیا ہےاور مردوں کواپنے کردار کا محاسبہ کرنے کی دعوت دی ہے۔

زینت ساجدہ اپنے عصر کے حالات سے باخبر تھیں۔سماج کے اہم مسائل پران کی نظر تھی اوروہ ان مسائل پر گہرائی کےساتھ غوروفکر کرتی ہیں۔وہ معمولی سے معمولی باتوں کا سہارا لے کر زندگی کے پوشیدہ حقائق کوقاری کے روبرو کرتی ہیں اوران کوجھنجھوڑنے کی کوشش کی ہے جس سے وہ اس مسائل کی طرف غورو فکر کرسکیں۔

۱؎ چلی گئی گرمی جب بیلا پھولے آدھی رات،اسلوب بیان اور،اردو مجلس،حیدرآباد،۲۰۰۹ء،ص ۱۰۵۔۱۰۶

۲؎ اگر میں مرد ہوتی،اسلوب بیان اور،اردو مجلس،حیدرآباد،۲۰۰۹ء،ص ۸۷

گفتگو کا انداز

گفتگو کسی بھی فرد کی شخصیت کو منکشف کرنے میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔ جب کوئی فرد گفتگو کرتا ہے تو اس کی شخصیت کے مختلف پہلو رونما ہوتے ہیں۔ انشائیہ میں انشائیہ نگار اپنی ذات کو منکشف کرنے کے لئے ہلکے پھلکے اور آزادانہ اسلوب کے ذریعہ قاری سے گفتگو کرتا ہے اور اس کو اپنے احباب میں شامل کرنے کے لئے وہ اپنے گفتگو کے انداز کو موثر بنانے کی پوری کوشش کرتا ہے۔ انشائیہ نگار بے تکلفانہ اور غیر رسمی انداز میں قاری سے گفتگو کرتا ہے اور کبھی کبھی وہ اپنے جذبات واحساسات اور تجربات ومشاہدات کو بیان کرنے کے لئے خود سے بھی ہم کلام ہوتا ہے۔

زینت ساجدہ نے اپنے انشائیوں میں تاثر پیدا کرنے کے لئے مخاطبت کا انداز اختیار کیا ہے اور جگہ جگہ پر خود کلامی بھی کرتی نظر آتی ہیں۔ انہوں نے جس انداز میں اپنے انشائیوں میں گفتگو کی ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انہیں گفتگو کے انداز پر مہارت حاصل ہے۔ ان کی گفتگو میں روانی برجستگی اور پختگی ہے اور موضوع پر گہری گرفت ہونے کی وجہ سے وہ کسی بھی غیر سنجیدہ بات کو بہت آسانی سے قاری کو اعتماد میں لیتے ہوئے بیان کر جاتی ہیں۔ وہ کثیر موضوع پر بہت ہی بے باکی سے اپنی رائے رکھتی ہیں لیکن اس میں وہ ناشائستہ اور ناگوار الفاظ سے گریز کرتی ہیں گویا وہ اپنے موضوع کے تحت خوشگوار انداز میں گفتگو کرتی ہیں۔ مثال کے طور پر انشائیہ ''اگر اللہ میاں عورت ہوتے'' کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

> ''میرا درد بالکل کم ہو گیا۔ اب سکون ہی سکون ہے۔ آرام ہی آرام۔ شاید ستر ماوں کی ماں نے جان لیا تھا کہ عورت کے دکھ درد کیسے ہوتے ہیں۔ لیکن کاش کوئی مجھے بتادے کہ خدا سچ مچ عورت ہی ہے۔'' [1]

اس اقتباس میں زینت ساجدہ نے اپنے جذبات کو پیش کرتے ہوئے خاتون کی زندگی کے درد و الم کو بیان کیا ہے اور خدا کی رحمدلی کی صفت کا ذکر کیا ہے انہوں نے قاری کو مخاطب کرتے ہوئے خدا کی جنسی صفت کے بارے میں سوال کرتے ہوئے ان کی رائے کو بھی جاننے کی کوشش کی ہے۔

انشائیہ ''رہیے اب ایسی جگہ چل کر'' میں انشائیہ نگار نے قاری سے گفتگو کا انداز اپناتے ہوئے دو

---

[1] اگر اللہ میاں عورت ہوتے، اسلوب بیان اور، اردو مجلس، حیدرآباد، ۲۰۰۹ء، ص ۲۴

متضاد معاشرے کے حالات اور اہلیان کا ذکر کیا ہے۔ مثال کے طور پر اقتباس پیش ہے:

''آپ کہیں گے غالب پر جو گزری سو گزری لیکن تم بھلا کہاں کے سقراط زماں اور افلاطون دوراں ہو کہ تنہائی پسند ہو گئے۔ اے جناب دنیا میں اب بھی غنیمت ہے جو ہم صورت یہاں دو چار بیٹھے ہیں۔ بعد میں تو سوچو گے اور سید انشا کی غزل کا مصرعہ دہراؤ گے اور اپنا سر آپ پھوڑو گے۔ دنیا آنی جانی ہے۔ چل چلاو لگا ہوا ہے۔ اب اگر کوئی تمہارا مزاج پوچھتا ہے، دو چار گھڑی اپنا دل بہلانے اور غم بانٹنے تمہارے پاس آ بیٹھتا ہے تو اپنی قسمت پر ناز کرو کہ خدا نے تمہیں بھی اس قابل بنایا۔ ورنہ آج کل تو ایسا نفسا نفسی کا عالم ہے کہ کوئی کتا بھی نہیں پوچھتا۔''[1]

مذکورہ بالا اقتباس میں انشائیہ نگار نے دو متضاد معاشرے کی عکاسی کی ہے قاری سے گنجلک آبادی والے معاشرے میں لوگوں کے ساتھ تعلقات اور معاملات گفتگو کرتے ہوئے مثبت و منفی اثرات بھی بتائے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ وہ خود کو اس معاشرے سے الگ کرتے ہوئے تنہا پسند ہونے پر بھی غور کرتی ہیں۔

زینت ساجدہ مرزا غالب سے بہت زیادہ متاثر تھیں۔ انشائیہ ''ذکر تیرا تجھ سے بہتر ہے کہ اس محفل میں ہے'' میں انہوں نے غالب کی شخصیت کو موضوع بناتے ہوئے جگہ جگہ مخاطبت کے انداز کو اپناتے ہوئے قاری کو اعتماد میں لینے کی کوشش کی ہے۔ مثال کے طور پر اقتباس دیکھئے:

''اور سنئے جناب، اب تو آپ انٹرنیشنل ہو گئے ہیں۔ ہندستان اور پاکستان کا کیا ذکر، ایران توران، سمرقند و بخارا، روس و امریکہ، لندن و پیرس ہر جگہ آپ ہی آپ ہیں۔ اے کاش کوئی ابن مریم آج نہ ہو اور نہ آپ ان دنوں اپنے اس طرح ہاتھوں ہاتھ لیے جانے کو دیکھتے تو پھولے نہ سماتے۔ عمر بھر کے گلے شکوے مٹ جاتے۔ ڈنڈا، لوٹا اور سوت کی رسی کے بغیر ہی ساری دنیا گھوم آتے اعلی درجے کی ہوٹلوں میں ٹھہرائے جاتے اور پینے کو ایک سے ایک بڑھیا شراب ملتی اور قدم قدم پر حسن بتاں سے ضیافت ہوتی۔ اگر جیتے رہتے تو اپنی آنکھوں سے یہ سب

[1] رہیے اب ایسی جگہ چل کر، اسلوب بیان اور، اردو مجلس، حیدرآباد، ۲۰۰۹ء، ص ۴۸

کچھ دیکھ لیتے پر ہائے افسوس عمر نے وفا نہ کی۔'' [1]

مذکورہ اقتباس میں انشائیہ نگار نے غالب کی شخصی صفات پر گفتگو کی ہے۔انہوں نے طنزیہ اور مزاحیہ انداز سے گفتگو کا انداز اختیار کرتے ہوئے غالب کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے اور یہی انوکھا گفتگو کا انداز قاری کی دلچسپی کو ضائع نہیں ہونے دیتا ہے۔

زینت ساجدہ نے اپنے جذبات واحساسات کو بیان کرنے میں خود کلامی کی تخلیق کا بھی سہارا لیا ہے۔انہوں نے اپنے مختلف انشائیوں میں خود سے ہم کلامی کرتے ہوئے موضوع کو موثر بنایا ہے۔وہ خود کلامی کے ذریعے اپنے جذبات واحساسات اور مشاہدات وتجربات کو اجتماعی ماحول کے پس منظر میں عکاسی کرتی ہوئی قاری کو خارجی مسائل کی طرف راغب کرتی ہیں۔مثال کے طور پر انشائیہ ''دیکھا دیکھی'' کا ایک اقتباس ملاحظہ:

''ہم سوچتے ہیں یہ سب ہوتا ہے تو پھر کیا برا ہے، دیکھا دیکھی کچھ بھلے کام بھی ہوں۔مثلاً سوشل سروس کرنے والا ایک گروہ گندہ بستی کی صفائی کرے تو دوسرا سارے ملک کی گندگی کو صاف کر کے رکھ دے۔ایک لاکھ پتی ایک اسکول کھولے تو دوسرا کروڑ پتی پندرہ بیس اسکول کالج چلانے لگے۔پھر دیکھیے سدھار کی تحریک کتنی آسان ہوجائے گی۔ایک آدمی سدھرا کہ دیکھا دیکھی سارے آدمی سدھر گئے۔'' [2]

مذکورہ بالا اقتباس میں زینت ساجدہ نے خود کلامی کو اپناتے ہوئے معاشرے میں رائج بری روایات کو ختم کرنے اور اور ایک صحت مند معاشرے کی تشکیل کے لئے خود سے ہم کلام ہوتی ہیں اور ساتھ ہی ساتھ قاری کے ذہن کو بھی اس فکر کی طرف آمادہ کرتی ہیں۔

خود کلامی کی ایک اور مثال انشائیہ ''میں نے نوکری کی'' سے ملاحظہ ہو جس میں انشائیہ نگار نے بحیثیت ایک ملازم نوکری سے متعلق مسائل کو بیان کیا ہے۔وہ اپنے پیشے کے متعلق اپنے جذبات کو خود سے

1۔ ذکر تیرا تجھ سے بہتر ہے کہ اس محفل میں ہے، اسلوب بیان اور، اردو مجلس، حیدرآباد، ۲۰۰۹ء، ص ۱۰۰

2۔ دیکھا دیکھی، اسلوب بیان اور، اردو مجلس، حیدرآباد، ۲۰۰۹ء، ص ۸۷

ہم کلام ہوتے ہوئے یوں بیان کرتی ہیں:

''اس میں کیا شک ہے۔شامت ہی آئی تھی ورنہ ہم بھی آج نوکری کرنے والوں کوخوش قسمت سمجھا کرتے اور دھمکی دیا کرتے کہ نوکر ہو جائیں گے۔لیکن اب تو بس جگر تھام کے یہی کہتے ہیں،وہ دن گئے کہ کہتے تھے نوکر نہیں ہوں میں۔۔۔۔۔نہ سر کے بال سفید ہوتے اور نہ آنکھوں کی بینائی کے زائل ہونے کا اندیشہ رہتا۔گھر میں بیٹھے ٹھاٹھ کیا کرتے۔لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ سب کسی نہ کسی کی بددعا کا نتیجہ ہے۔''[۱]

زینت ساجدہ نے اپنے دیگر انشائیوں میں بھی قاری کو مخاطب کرتے ہوئے گفتگو کی ہے اور جگہ جگہ وہ خود سے بھی ہم کلام ہوتی نظر آتی ہیں۔انہوں نے قاری کی دلچسپی کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے بہت ہی سلیقہ مندی کے ساتھ موضوع پر گفتگو کی ہے اور اپنی گفتگو کے قرینے سے قاری کو متاثر کیا ہے۔ان کے انشائیوں کے مطالعے سے یہ واضح ہے کہ وہ گفتگو کے سلیقے سے خوب واقف ہیں۔

طنز ومزاح

اردو میں طنز یہ وظریفانہ مضامین کو عام طور پر انشائیہ تسلیم کرلیا جاتا ہے۔رسالوں اوراخباروں میں شائع مضامین اور خاکے وغیرہ کواس کے ہلکے پھلکے اور شگفتہ اسلوب کے باعث انشائیہ کی فہرست میں شمار کیا جانے لگتا ہے یا اگر کوئی ادیب اپنے مضمون میں پوری طرح طنز ومزاح کو بروئے کار نہیں لا پاتا ہے تو اسے انشائیہ کا نام دے دیا جاتا ہے گویا کہ ایک ناکام قسم کا مضمون انشائیہ کی حیثیت پالیتا ہے۔

انشائیہ بھلے ہی مضمون نگاری کی ایک مختص شکل ہے لیکن ادب میں یہ ایک صنف کی حیثیت رکھتا ہے نہ طنز ومزاح کی طرح کسی صنف کا انداز تحریر۔اس سلسلے میں انشائیہ کی امتیازی حیثیت کو انیس ناگی اس طرح بیان کرتے ہیں:

''مضمون یا مقالہ سیال قسم،کی ادبی ہیئت ہے جو تصور یا جذبہ کے ساتھ مختلف رنگ اختیار کرتی ہے اس لیے اس کی کوئی معین ہیئت نہیں ہے یہ موم کی ناک ہے

[۱] میں نے نوکری کی،اسلوب بیان اور،اردو مجلس،حیدرآباد،۲۰۰۹ء،ص ۸۰

اگر ہنسی مذاق پھبتی، جگت سے انشائیہ جنم لیتا ہے تو پھر 'نقال' بہت بڑے انشاء پرداز ہیں اور تہواروں پر ان کے جواب الجواب اور تمسخر انشائیوں کے مجموعے ہیں۔'' [۱]

اردو ادب میں طنز و ظرافت کی تخلیق چونکہ دیگر اصناف کے مقابلے میں مضمون کے ہی طرز پر ہوئی ہے۔ انشائیہ کے فن سے ناواقفیت کے باعث عام تحریروں کو بھی انشائیہ کے زمرے میں شامل کیا جانے لگا۔ طنز و مزاح کی شوخی اور انشائیہ کی شگفتگی کی تفریق بھی نہ کی جا سکی اور یہی سبب ہے کہ ایک طنز و مزاح نگار کو بھی ایک انشائیہ نگار بھی تسلیم کیا جانے لگا جب کہ ان دونوں اصناف کا طریقہ کار اور اسلوب مختلف ہے۔

انشائیہ میں طنز و مزاح کی شمولیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے کیوں کہ اس میں طنز و مزاح کے فن کو متوازن مقدار میں ایک معاون قوت کے طور پر استعمال میں لایا جاتا ہے۔ لیکن یہ انشائیہ کے مقاصد میں شامل نہیں ہے بلکہ جارحانہ اور شدید قسم کا مزاح انشائیہ کی بنیادی ہیئت کے خلاف ہے۔ اگر طنز و مزاح کا کثرت سے استعمال کیا جاتا ہے تو وہ انشائیہ نہیں کہلائے گا بلکہ مزاحیہ مضمون کے نام سے جانا جائے گا۔ انشائیہ میں استعمال ہونے والے ہلکے پھلکے مزاح کو ہی ''تازگی'' کا نام دیا جاتا ہے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر اختر اورینوی نے اپنی رائے یوں رکھی ہے:

''انشائیوں میں مزاح کا عنصر بھی ضروری ہے ایک انشائیہ نگار مزاح کے ترکش کا ہر تیر استعمال کر سکتا ہے مگر سلیقہ شرط ہے مثلاً مزاح لطیف سے لے کر طنز تک کی یہاں گنجائش ہے اور ہنسی مذاق، بولی ٹھولی، پھبتی، سوانگ، گدگدی، چٹکی اور ظرافت کی دوسری قسموں کا برمحل استعمال انشائیوں میں جان ڈال دیتا ہے۔ جملہ بازی اور فقرہ کہنا یا وقت کی سوجھ بوجھ یا کوئی پتہ کی بات کہہ دی یا کوئی چبھتا ہوا ریمارک یا ہلکی پھلکی سی چوٹ یہ سب کچھ ہو سکتا ہے۔ ظرافت کا استعمال ہر جگہ خوش مذاقی چاہتا ہے۔'' [۲]

طنز و مزاح میں ادیب کسی مروجہ فرسودہ روایات، مضحکہ خیز اور ناقابل قبول حالات پر اپنے غصے کو

۱۶۰۔ انیس ناگی، بحوالہ ڈاکٹر سلیم اختر، انشائیہ کی بنیاد، عفیف پرنٹرس، دہلی، ۲۰۱۴ء، ص ۳۷۴

۱۶۱۔ ڈاکٹر اختر اورینوی، بحوالہ ڈاکٹر سلیم اختر، انشائیہ کی بنیاد، عفیف پرنٹرس، دہلی، ۲۰۱۴ء، ص ۱۸۷۔۱۸۸

ظاہر کرنے کے لئے تحریری شکل دیتا ہے جبکہ انشائیہ نگاری میں بے تکلفی اور دوستانہ فضا میں قاری کو شریک کر کے اسے غور وفکر کا ایک نیا زاویہ فراہم کیا جاتا ہے یعنی کہ بہجت کے جذبات طنزیہ مزاحیہ تحریر میں طنز و ظرافت کی شکل میں ایک ردعمل کی صورت اختیار کرتے ہیں جبکہ انشائیہ میں محض ان جذبات کی عکاسی ہوتی ہے۔اس ضمن میں ڈاکٹر وزیر آغا لکھتے ہیں:

> ''طنزیہ مزاحیہ مضامین انشائیہ نگاری کے مختلف اسالیب نہیں بلکہ قطعاً الگ قسم کی تحریریں ہیں اور یہ فرق محض لہجہ اور انداز کا فرق نہیں ہے مزاج کا فرق بھی ہے۔مثلاً غور کیجیے کہ ایک مزاحیہ مضمون کا طرّہ امتیاز یہ ہے کہ اس میں فاضل جذبہ خارج ہو جاتا ہے جبکہ انشائیہ میں جذبہ صرف ہوتا ہے۔'' [1]

انشائیہ اور طنزیہ و مزاحیہ مضمون میں جذبے کے صرف ہونے کی نوعیت مختلف ہونے کی وجہ سے ان دونوں میں پیدا ہونے والا تاثر بھی علیحدہ ہوتا ہے۔انشائیہ چونکہ فطری اظہار، انشائیہ نگار کے خیالات و تاثرات کا ترجمان ہوتا ہے اور ایک متوازن اور مہذب شخصیت کا اظہار خیال ہے اس لئے اس میں ایک ٹھہرا اور لطیف انداز پایا جاتا ہے۔

انشائیہ کا بنیادی مقصد انشائیہ نگار کی ذات کو براہ راست یا بالواسطہ طور پر قاری کے سامنے بے نقاب کرنا ہوتا ہے اور اپنی اسی ذات کو منکشف کرنے کے لیے وہ عموماً بالواسطہ طور پر ہی ذاتی اور نجی خیالات کا اظہار کرتا ہے اور ایسی باتوں کو بیان کر جاتا ہے جو غیر منطقی اور استدلال سے خالی نظر آتی ہیں لیکن ہم انہیں لایعنی، بیہودہ اور غلط بھی نہیں گردان سکتے کیوں کہ انشائیہ نگار یہ سب کچھ قاری کو اعتماد میں لینے کے لئے کرتا ہے جس میں اس کو ہلکے پھلکے مزاح کی ضرورت ہوتی ہے۔اس سلسلے میں ڈاکٹر سلیم اختر یوں لکھتے ہیں:

> ''انشائیہ نگار اس مقصد کے لئے طنز و مزاح سے بھی کام لے سکتا ہے، لیکن صرف اسلوب میں شگفتگی اور اظہار میں تازگی پیدا کرنے کے لئے۔اس طرح قاری کو اکتاہٹ سے دور رکھا جاتا ہے۔'' [2]

---

[1] وزیر آغا، انشائیہ کا سلسلہ نسب، مشمولہ: تنقید اور مجلس تنقید، نئی دہلی، ۱۹۸۲، ص ۵۳

[2] ڈاکٹر سلیم اختر، انشائیہ کی بنیاد، عفیف پرنٹرس، دہلی، ۲۰۱۴ء، ص ۱۸۰

اسی ضمن میں ڈاکٹر سلیم اختر مزید رقم طراز ہیں:

''بعض اوقات طنز کی ترشی یا مزاح کی چاشنی سے ایک چیز ے دیگر پیش کی جاتی ہے یہ گویا قاری کو جیتنے کے لئے ایک رشوت یا چاٹ ہے اور یہ پہلو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا ہے۔'' ۱؎

انشائیہ انداز بیان کے اعتبار سے بھی ایک منفرد حیثیت رکھتا ہے۔غیر رسمی انداز بیان اس کی اہم صفت ہے اور اس کو اختیار کرتے وقت انشائیہ نگار ہلکے پھلکے طنز کے تیر بھی چلاتا ہے اور مزاح کا رنگ بھی ڈالتا ہے جو اس کے اسلوب کو انفرادی درجہ عطا کرتے ہیں۔اس سلسلے میں سلام سندیلوی لکھتے ہیں:

''انشائیہ میں طنز و مزاح بالذات اہم ہوتا ہے۔انشائیہ میں طنز و مزاح بھی شامل کیا جاسکتا ہے۔انشائیہ میں طنز و مزاح کے ذریعے انشائیہ نگار ایک ذاتی اور انفرادی اسلوب اختیار کرسکتا ہے۔'' ۲؎

ان تمام مذکورہ اقتسابات سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ انشائیہ،طنزیہ مزاحیہ مضامین سے مقاصد یا اسلوب کے اعتبار سے مختلف ہے۔طنز و مزاح کے عناصر انشائیے میں استعمال میں تو لائے جاسکتے ہیں لیکن ان کی حیثیت معاون قوت کی ہی ہوگی۔حتیٰ کہ طنز و مزاح کا مقام بھی انشائیہ میں وہی ہے جو دیگر اجزاء کا ہے اور جن کی شمولیت انشائیہ میں ممکن ہوسکتی ہے۔مثلاً ڈرامائیت،افسانوی انداز،شاعرانہ احساس،فلسفیانہ تفکر وغیرہ لیکن ان تمام یا کسی ایک عنصر کی عدم موجودگی سے انشائیہ کی ہیئت پر کوئی فرق نہ آئے گا۔

زینت ساجدہ ایک مزاح نگار بھی ہیں جس کی بدولت ان کے انشائیوں میں طنز و مزاح بھی نمایاں ہوتے ہیں۔ان کے انشائیوں میں طنز کے ساتھ مزاح بھی ہلکے پھلکے انداز میں نظر آتا ہے۔ویسے مزاح اور طنز انشائیہ کا لازمی جز نہیں ہے لیکن زینت ساجدہ نے اس کا سہارا لے کر اپنے اسلوب کو انفرادیت بخشی ہے۔مثال کے طور پر انشائیہ ''اگر میں مرد ہوتی'' میں انشائیہ نگار خود کو بطور ایک مرد تسلیم کرتے ہوئے مردوں کے کردار اور رجحانات پر طنز کے تیر چلائے ہیں۔اقتباس پیش ہے:

۱؎ ڈاکٹر سلیم اختر،انشائیہ کی بنیاد،عفیف پرنٹرس،دہلی،۲۰۱۴ء،ص ۱۷۴

۲؎ ادب کا تنقیدی مطالعہ،بحوالہ ڈاکٹر سلیم اختر،انشائیہ کی بنیاد،عفیف پرنٹرس،دہلی،۲۰۱۴ء،ص ۳۰۲

''اگر قسمت ساتھ دیتی اور کچھ بن جاتا تو پچھلے دنوں یکسر بھول کر غریبوں کا خون چوستا، رشوت کا بازار گرم کرتا اور ایسی بیوی چاہتا جو بڑے باپ کی بیٹی ہوں، خوبصورت ہو پڑھی لکھی ہو، سوسائٹی میں شریک بن سکے اور ساتھ ہی ایک اونچے مکان، بڑھیا کار اور چالیس ہزار نقد بھی جہیز میں لا سکے اور اگر ضرورت پڑے تو اپنے باپ کے اثر ورسوخ سے کام لے کر مجھے اونچا عہدہ دلا سکے۔'' ۱

انشائیہ ''چار مینار پر غلاف'' میں بات سے بات پیدا کرتے ہوئے زینت ساجدہ نے عصر حاضر کے تعلیمی حالات بالخصوص ریسرچ کے حوالے سے طالب علموں کی اہلیت اور قابلیت پر طنز کے اوچھے وار کئے ہیں۔ مثال کے طور پر اقتباس ملاحظہ ہو:

''آجکل ریسرچ ایسے ہی چلتی ہے۔ لوگ چیلنج کرنے سے رہے کیونکہ انہیں اپنی لاعلمی بلکہ جہالت کا خوب خوب احساس ہے کیا معلوم اس بہانے ادب کی دنیا میں ایک بحث چھڑ جائے اور کوئی نہ کوئی پی۔ ایچ۔ ڈی کا طالب علم ثبوت وغیرہ بھی مہیا کر دے، ایک ضخیم مقالہ لکھیں اور ڈاکٹر بن جائے۔ چلیے اس فکر سے نجات ملی۔'' ۲

زینت ساجدہ نے انشائیہ ''دیکھا دیکھی'' میں بھی لوگوں کی نقل کرنے کی حرکات کو بڑے ہی مزاحیہ انداز میں سیدھے سادھے اسلوب میں بیان کیا ہے۔ مندرجہ ذیل اقتباس میں انہوں نے عصر حاضر کے سیاسی نظام کو مدنظر رکھا ہے۔ اقتباس ملاحظہ ہو:

''آج کل دیکھا دیکھی یہ ہوتا ہے کہ کچھ طالب علموں نے نالائقی کی اور استادوں پر ہاتھ صاف کیا تو سب نے یہی سیکھ لیا۔ ایک لیڈر نے دھواں دار تقریر کی تو دوسرے لیڈروں نے تقریروں کا وہ سلسلہ باندھا کہ سننے والے عنقا ہو گئے۔ ایک وزیر نے ایک وعدہ توڑا تو دوسرے نے وعدوں کا ریکارڈ توڑ ڈالا۔ ایک ایم۔ ایل۔ اے یا ایم۔ پی نے برسر اقتدار پارٹی سے حصے بخرے کے

۱۔ اگر میں مرد ہوتی، اسلوب بیان اور، اردو مجلس، حیدرآباد، ۲۰۰۹ء، ص ۸۷

۲۔ چار مینار پر غلاف، اسلوب بیان اور، اردو مجلس، حیدرآباد، ۲۰۰۹ء، ص ۵۹

معاملے میں ناراض ہوکر اپوزیشن کا رخ کیا تو آیا رام گیا رام کی وہ گردان شروع ہوگئی کی جمہوریت کا ایک نیا آمد نامہ مرتب ہوگیا۔'' [1]

انشائیہ ''میں نے نوکری کی'' میں زینت ساجدہ نے گھر کے نوکروں کے رویے اور عادات واطوار کو مزاحیہ انداز اپناتے ہوئے ہلکے پھلکے الفاظ میں بیان کیا ہے۔مثال کے طور پر اقتباس پیش ہے:

''بس اگر خوش ہے تو گھر کے نوکر۔اس لئے کہ ان کو الٹے استرے سے سر مونڈھنے کی پوری آزادی ہے۔جیسا بھی جی میں آئے کام کریں۔کچھ کہو تو نکل جانے کی دھمکی دیں۔سودا سلف چن چن کر خراب لائیں۔جلا بھنا پکائیں،آپ تر مال اڑائیں،ہمیں روکھی سوکھی کھلائیں،ہمارے گھر سے جانے کے بعد ہمارے صابن سے نہائیں۔صوفوں پر پاؤں اوپر رکھ کر آرام سے لیٹیں۔دن بھر تاش کھیلیں اور وقتاً فوقتاً گھر کے سامان کو بیکار قرار دے کہ کباڑے کے ہاتھ بیچ دیں۔وہ بھی جانتے ہیں کہ ہماری نوکری انہیں کے دم قدم سے ہے۔اس لیے احسان جتاتے ہیں۔'' [2]

زینت ساجدہ کی حیثیت ایک مزاح نگار کی بھی ہے اور وہ ایک منفرد اسلوب سے وابستہ ہیں۔انکے اسلوب میں تمثیل،تشبیہ وہ استعارے اور زبان کی شوخی کے ساتھ فلسفیانہ انداز بھی شامل ہے۔ان کے طنز کو پڑھنے کے بعد ہونٹوں پر مسکان اور ذہن میں خوشی کی لہر دوڑ جاتی ہے اور ذہن میں کشادگی کا احساس ہونے لگتا ہے۔کبھی کبھی ان کا یہ طنز و مزاح تلخی کا روپ بھی اپنا لیتا ہے۔

زبان و بیان

انشائیہ میں اسلوب اہم مقام رکھتا ہے اور انشائیہ کی کامیابی کا دارومدار بھی اسی اسلوب پر منحصر ہوتا ہے۔انشائیہ تخلیقی صنف ہونے کے سبب زبان کی سطح پر فنکاری اور تخلیقیت کا ثبوت مہیا کرتا ہے۔انشائیہ کی زبان و بیان پر اگر نظر ڈالیں تو یہ ادب کی دیگر اصناف سے اسی بنیاد پر منفرد حیثیت رکھتا ہے۔انشائیہ کی

۱۔ دیکھا دیکھی،اسلوب بیان اور،اردو مجلس،حیدرآباد،۲۰۰۹ء،ص۷۸

۲۔ میں نے نوکری کی،اسلوب بیان اور،اردو مجلس،حیدرآباد،۲۰۰۹ء،ص۸۲

زبان بلند سطح کی حامل ہوتی ہے۔اس میں شوخی اور سنجیدگی، تفکر اور تخیل، ایجاز و اختصار اور وضاحت، فلسفیانہ انداز فکر اور شاعرانہ احساس یہ تمام مختلف عناصر موجود ہوتے ہیں۔انھیں عناصر کی بنا پر انشائیہ کی زبان اپنے اندر انفرادیت رکھتی ہے یعنی انشائیہ میں شوخی و شگفتگی اور بے تکلف گفتگو کا انداز پایا جاتا ہے۔انشائیہ کے اسلوب کا ذکر کرتے ہوئے ڈاکٹر سلیم اختر نے اپنی رائے یوں رکھی ہے:

> ''بعض اوقات انشائیہ نگار عام زندگی کی ان چھوٹی چھوٹی اور غیر اہم باتوں کو لیتا ہے اور انہیں ایک ایسے نئے یا انوکھے زاویے سے دکھاتا ہے کہ قطرہ میں دجلہ دکھانے والی بات بن جاتی ہے۔اگرچہ اس مقصد کے لئے دیدہ بینا کی بھی ضرورت ہوتی ہے لیکن اظہار کے لیے اسلوب ہی وسیلہ بنتا ہے۔بڑے یا دلچسپ موضوع پر اچھی تحریر اس بنا پر آسان ہے کہ یہاں خود موضوع لکھنے والے کی مدد کرتا ہے لیکن انشائیہ نگار جب غیر اہم چیزوں کے بارے میں یوں گفتگو کرتا ہے گویا وہ گفتگو ہی نہیں کر رہا یا نیم سنجیدہ ہوکر سنجیدگی کی بات کرتا ہے یا بھولا بن کر دانائی کی بات کرتا ہے تو یہ سب صرف اسلوب کی بنا پر ہی ممکن ہوسکتا ہے۔''[1]

سنجیدگی انشائیہ کا بنیادی وصف نہیں ہے اور نہ ہی اس کی عدم موجودگی سے انشائیہ کی ہیئت پر بہت زیادہ اثر پڑے گا بلکہ شگفتگی اور لطافت اسکی بنیادی صفات میں شامل ہیں۔اس سلسلے میں یوسف سرمست کا کہنا ہے کہ اس میں جو فلسفہ حکمت اور سائنس جیسے موضوعات پر بھی بحث ہوتی ہے جس کی وجہ سے سنجیدگی رونما ہوتی ہے۔لیکن یہ انشائیہ نگار کا فن ہوتا ہے کہ وہ اپنے فنکارانہ انداز بیان کی بدولت مضامین کو مشکل ہونے سے بچالیتا ہے۔چنانچہ وہ فرماتے ہیں:

> ''انشائیہ کا اسلوب اگرچہ شگفتہ، سلیس، سادہ اور نرم و نازک ہوتا ہے لیکن اس کے باوجود انشائیہ میں فلسفہ، حکمت اور سائنس جیسے موضوعات بھی زیر بحث آجاتے ہیں لیکن انشائیہ نگار کا مقصد ان کی گہرائیوں میں جاکر ان کی تشریح کرنا نہیں ہوتا۔ہاں سلسلہ بیان میں دلی تاثرات کو ظاہر کرنے کے لئے وہاں سے مدد ضرور

[1] ڈاکٹر سلیم اختر، انشائیہ کی بنیاد، عفیف پرنٹرس، دہلی، ۲۰۱۴ء، ص ۲۴۸۔۲۴۹

لیتا ہے۔'' [1]

انشائیہ کی خوبیوں میں خود کلامی بھی ایک اہم درجہ رکھتی ہے، فلسفیانہ انداز فکر بھی انشائیہ میں موجود ہوتا ہے لیکن انشائیہ میں فلسفہ کے مسائل کو سمجھانے کا کام نہیں کیا جاتا ہے بلکہ اس کی مدد سے لطیف نکتہ پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اس لئے انشائیہ کی زبان تحقیقی مضامین سے مختلف نظر آتی ہے اور اپنے دامن میں شگفتگی اور تجربے کی تازگی کو سمیٹے ہوئے ہے۔ چونکہ انشائیہ ایک نثری صنف ہے جو وضاحت اور تفصیل کے اظہار پر مشتمل ہے۔ لیکن اس میں اشاریت اور کفایت لفظی کا استعمال اس کو دوسری اصناف سے ممتاز کرتا ہے جو شاعرانہ اسلوب سے ہم آہنگ نظر آتا ہے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر سلیم اختر نے اپنی رائے کا اظہار یوں کیا ہے:

> ''شاعرانہ اسلوب اور استعاراتی پیرایہ سے بچ کر سیدھی سادی نثر میں اگر انشائیہ کی تعریف مقصود ہو تو پھر میرے خیال میں۔'' بیدار ذہن کی حامل تخلیقی شخصیت کی زندگی کے تنوع سے زہ دلچسپی کے بامزا نثر میں مختصر اور لطیف اظہار کو انشائیہ قرار دیا جا سکتا ہے۔'' [2]

استعاراتی اسلوب کے سلسلے میں ڈاکٹر سلیم اختر ''انشائیہ کی بنیاد'' میں یوں فرماتے ہیں:

> ''ادھر اپنے انشائیہ نگاروں کی اکثریت کا اسلوب بالعموم استعارہ کی قوت سے معرّا نظر آتا ہے اگرچہ تشبیہ سے بھی بات میں رنگ آجاتا ہے لیکن استعارہ سے نثر میں جو پر جمال توانائی کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے وہ اپنی مثال آپ ہے محمد حسین آزاد کی نثر جو آج بھی خراج تحسین حاصل کر رہی ہے تو اس کا ایک سبب استعارہ سے ان کا خصوصی شغف بھی ہے۔ استعارہ کا اسلوب کی نفسیات سے جو گہرا تعلق ہے اس پر ہمارے یہاں اب تک غور نہیں کیا گیا ہے۔'' [3]

انشائیہ نگار کی خاصیت اس کی روانی ہے اور یہ تب ہی ممکن ہے جب اسے زبان و بیان پر قدرت

۱۔ یوسف سرمست، عرفان نظر، ۱۹۷۷ء، ص ۱۱۵

۲۔ ڈاکٹر سلیم اختر، انشائیہ کی بنیاد، عفیف پرنٹرس، دہلی، ۲۰۱۴ء، ص ۲۱۰

۳۔ ڈاکٹر سلیم اختر، انشائیہ کی بنیاد، عفیف پرنٹرس، دہلی، ۲۰۱۴ء، ص ۲۵۵

حاصل ہو۔زینت ساجدہ کو زبان و بیان پر کافی عبور حاصل تھا اس سے ظاہر ہے کہ وہ لسانیات پر کافی مہارت رکھتی تھیں۔ان کی زبان صاف شفاف اور چست ہے۔ان کی زبان میں کہاوتوں کی جھلک بھی نظر آتی ہے اور بہت ساری سطروں میں انہوں نے ضرب المثل کا استعمال کرتے ہوئے اپنے انشائیوں کو مزین کیا ہے۔مثال کے طور پر ان کے انشائیہ ''خالہ ماں سلام'' سے ایک اقتباس پیش ہے:

> ''گیدڑ کی موت آتی ہے تو وہ شہر کا رخ کرتا ہے۔اور ہماری جو شامت آئے تو ملازمت اختیار کی اب اس کے گونا گوں فائدوں اور نعمتوں سے مفر کہاں، چنانچہ وبائی امراض کی طرح ہم پر بھی حملے ہوتے رہتے ہیں۔'' [1]

مذکورہ بالا اقتباس میں انشائیہ نگار نے اپنی ذات کو بیان کرنے کے لیے بہت ہی مشہور کہاوت کا سہارا لیا ہے جس سے انشائیہ کے اسلوب میں ایک لطف پیدا ہو جاتا ہے۔

انشائیہ ''مکان بنا ڈالا'' میں بھی انشائیہ نگار نے موقع و محل کے اعتبار سے کہاوتوں کا استعمال کیا ہے۔مثال کے طور پر جب وہ مکان بنانے کا ارادہ کرتی ہیں تو ان کے احباب کے ذریعے دیے جانے والے مشورہ کو وہ اس انداز میں بیان کرتی ہیں۔اقتباس پیش ہے:

> ''ہم نے کہا قرض کے بوجھ کے ساتھ سود بھی تو دھرا ہے۔کہا کرایہ سمجھ لو۔ایک نہ ایک دن قرض ادا ہو ہی جائے گا۔پھر گھر اپنا، کوئی یہ تو نہ کہے گا کہ چھوڑ دو، کرایہ بڑھاؤ۔۔۔۔۔۔ہمت مرداں مدد خدا۔سو ہم نے بھی ہمت کر ڈالی۔پھر خیر خواہوں نے دلاسا دلایا باہمت لوگوں اور ان کی کامرانیوں کی مثالیں دیں، ہاتھ بٹانے اور دوڑ دھوپ میں ساتھ دینے کا وعدہ کیا۔'' [2]

مذکورہ بالا اقتباس میں ''ہمت مرداں مدد خدا'' کہاوت ہے۔اسی انشائیہ میں انہوں نے بہت ہی خوبصورتی کے ساتھ اور بھی دوسری کہاوتوں کا استعمال کیا ہے جو مضمون کے اعتبار سے مناسبت بھی رکھتی ہیں۔مثلاً اقتباس پیش ہے:

---

[1] خالہ ماں سلام، اسلوب بیان اور، اردو مجلس، حیدر آباد، ۲۰۰۹ء، ص ۶۹

[2] مکان بنا ڈالا، اسلوب بیان اور، اردو مجلس، حیدر آباد، ۲۰۰۹ء، ص ۴۳

''مکان کیا ہوا سانپ کے منہ میں چھچھوندر ہوا، نہ اگلتے ہی بنے نہ نگلتے ہی۔ نتیجہ یہ ہے کہ دھوپ نے رنگ کالا کر دیا (جو پہلے بھی کچھ گورا نہ تھا) چڑ چڑے اور بدمزاج بن گئے۔ پہلے ہماری محفل میں گل و بلبل، عارض و رخسار، ناول و افسانہ، ادب اور سماج، انسان اور انسانیت کے تذکرے ہوتے تھے اور آج کل وڈر، اوڑ، بیلدار اور مستری سے بنڈ، گنٹ، کڑیاں، گنڈ، پھاوڑا اور دھمس کی بات کرتے ہیں اور اینٹ چونے، سیمنٹ اور لوہے کی فکر میں گھلے جا رہے ہیں۔''[1]

مذکورہ اقتباس میں سانپ کے منہ میں چھچھوندر ہوا محاورہ ہے جس کا استعمال کرتے ہوئے زینت ساجدہ نے مکان تعمیر کراتے وقت اپنی کیفیت کو بیان کیا ہے۔ ان کے انشائیہ ''گنڈی پیٹ کا پانی'' میں بھی محاوروں کا حسین استعمال دیکھیے۔ اقتباس پیش ہے:

''اس کے راستے میں نارسنگی کا وہ مشہور و معروف بازار ملتا ہے جہاں لوگ بھینس خرید کر لاتے ہیں اور اس کے آگے بین بجانے کی کوشش کرتے ہیں۔ گنڈی پیٹ میں پانی ہے اور اطراف کچھ خشکی کچھ تری۔ چھٹی کے دنوں میں لوگ باغ وہاں جاتے ہیں اور مونگ پھلی اور چھڑوا کھاتے ہیں۔''[2]

مذکورہ بالا اقتباس میں انشائیہ نگار نے بھینس کے آگے بین بجانے والی کہاوت کو استعمال میں لاتے ہوئے حیدرآباد کی ثقافتی نشانی کا ذکر کیا ہے۔ اسی انشائیہ کا ایک اور اقتباس ملاحظہ ہو:

''گھر میں پینے کے لئے میٹھے پانی کو سنبھال کر بڑے جتن سے رکھا جاتا تھا۔ کھارے پانی سے دوسرے کام چلانے پڑتے تھے یہ نہیں کہ جی کھول کر جتنا جی چاہا خرچ کیا پینے کا پانی الگ اور برتنے کا الگ جیسے ہاتھی کے دانت کھانے کے اور دکھانے کے اور۔''[3]

۱۔ مکان بنا ڈالا، اسلوب بیان اور، اردو مجلس، حیدرآباد، ۲۰۰۹ء، ص ۴۷

۲۔ گنڈی پیٹ کا پانی، اسلوب بیان اور، اردو مجلس، حیدرآباد، ۲۰۰۹ء، ص ۵۷

۳۔ گنڈی پیٹ کا پانی، اسلوب بیان اور، اردو مجلس، حیدرآباد، ۲۰۰۹ء، ص ۵۵

مذکورہ بالا اقتباس میں ہاتھی کے دانت کھانے کے اور دکھانے کے اور کہاوت ہے جس کو برمحل استعمال میں لاتے ہوئے انشائیہ نگار نے پانی کی اہمیت کو اجاگر کیا ہے۔

انشائیہ ''دیکھا دیکھی'' میں بھی انہوں نے کہاوتوں کو برمحل استعمال میں لاتے ہوئے معاشرے میں رائج نقل کرنے کے طریقے کو بڑے ہی لطیف انداز میں بیان کیا ہے چنانچہ اس انشائیہ ابتدائی اقتباس پیش ہے:

> ''دیکھا دیکھی چولہا پھونکی'' عورتوں کو کہتے آپ نے ضرور سنا ہوگا۔ ممکن ہے مرد بھی کہتے ہوں، میں نے نہیں سنا مگر میری سمجھ میں آج تک یہ نہیں آتا کہ صرف چولہا پھونکی ہی کیوں؟ گھوڑا چڑھی یا کتاب پڑھی کیوں نہیں۔'' [1]

مذکورہ اقتباس میں دیکھا دیکھی چولہا پھونکی کہاوت ہے۔ انشائیہ ''میں نے نوکری کی'' میں بھی انشائیہ نگار نے ایک مشہور کہاوت کے ذریعے اپنے احساسات کو بیان کیا ہے۔ مثال کے طور پر اقتباس پیش ہے:

> ''شام ہوئی اور خیر سے بدھو گھر کو لوٹے، نہ لوٹیں تو جائیں کہاں، گرگٹ کی دوڑ باغ تک۔ طبیعت نڈھال، دل اداس اور دماغ ماوف۔ نہ کہیں آنے کو جی چاہتا ہے نہ جانے کو۔ مزاج چڑچڑا۔'' [2]

مندرجہ بالا اقتباس میں شام ہوئی اور خیر سے بدھو گھر کو لوٹے اور گرگٹ کی دوڑ باغ تک کہاوتیں ہیں۔ اس کے علاوہ ان کے دیگر انشائیے جیسے چار مینار پر غلاف، میری مرغیاں، رہیے اب ایسی جگہ چل کر، چلی گئی گرمی جب بیلا پھولے آدھی رات، خالہ ماں سلام، وغیرہ میں کہاوتوں کے استعمال سے مزین نظر آتے ہیں۔ اوران کہاوتوں کا استعمال انشائیہ نگار نے بڑے باکمال انداز میں کیا ہے۔ اس سلسلے میں زینت ساجدہ کی کہاوتوں اوراس کے استعمال کے فن پر تبصرہ کرتے ہوئے ظفر الحسن نے ''اسلوب بیان اور'' کے ''پیش لفظ'' میں اپنی رائے کا یوں اظہار کیا ہے:

۱۔ دیکھا دیکھی، اسلوب بیان اور، اردو مجلس، حیدرآباد، ۲۰۰۹ء، ص ۷۵

۲۔ میں نے نوکری کی، اسلوب بیان اور، اردو مجلس، حیدرآباد، ۲۰۰۹ء، ص ۸۱

''زینت سے میری ایک فرمائش بھی ہے ان کے انشائیے'' خالہ ماں سلام'' میں قول نقل ہے کہ 'اچھے اچھے پھول اللہ میاں کی درگاہ پر، خراب خراب پھول بلّی کے چونڈے میں' میں نے یہ کہاوت آج تک نہیں سنی اور بہت پسند آئی۔ دوسرے انشائیوں میں بھی کہاوتیں ہیں جیسے 'دیکھا دیکھی چولہا پھونکی' بہت سی کہاوتیں اور اقوال ایسے ہوتے ہیں جن کے پس منظر میں کوئی نہ کوئی ثقافتی یا کوئی تلمیح ضرور ملے گی۔ میرے خیال میں اس سرمایہ کو محفوظ کر لینا چاہیے۔'' ۱

زینت ساجدہ نے اپنے انشائیوں میں محاوروں کا بھی استعمال کرتے ہوئے اس کو موثر بنانے کی کوشش کی ہے۔ انشائیہ ''بی جمالو'' میں انہوں نے محاوروں کو استعمال میں لاتے ہوئے معاشرہ کی عکاسی کی ہے۔ مثال کے طور پر اس انشائیہ کا ایک اقتباس پیش ہے:

''آج کل ہر شخص ایک جیسے حالات میں گرفتار تو ہے ہی۔ وقت خوب گزرے گا۔ تفریح رہے گی اور کچھ نہ کچھ کام کی باتیں بھی ہو جائیں گی۔ آم کے آم گھٹلیوں کے دام۔ چار آدمی سر جوڑ کر بیٹھیں گے تو غم ہلکا ہو جائے گا۔ ایک دوسرے کے کام آئے گا۔ بات سننے میں سب کو معقول معلوم ہوئی۔'' ۲

مذکورہ بالا اقتباس میں آم کے آم گھٹلیوں کے دام ایک محاورہ ہے۔ اسی انشائیہ کا ایک اور اقتباس جو محاوروں سے پر نظر آتا ہے، ملاحظہ ہو:

''سچ مچ یہ نہ ہوں تو دنیا کے کام ادھورے، غیر دلچسپ اور بے رنگ رہ جائیں اس کے خون سے اس کے ہاتھ رنگنا، اس کے گھی سے اس کی روٹی چپڑنا، اس کی ٹوپی اس کے سر رکھنا یہ سب ان کا کام ہے لیکن خود آپ بے دماغ ہیں ہر ایک کے کام آتی ہیں پھر انہیں برا کون کہے۔'' ۳

مذکورہ بالا اقتباس میں اس کے خون سے اس کے ہاتھ رنگنا، اس کے گھی سے اس کی روٹی چپڑنا اور

۱۔ مرزا ظفر الحسن، پیش لفظ، اسلوب بیان اور، حیدر آباد، ۲۰۰۹۔ ص ۱۰

۲۔ بی جمالو، اسلوب بیان اور، اردو مجلس، حیدر آباد، ۲۰۰۹ء، ص ۳۶

۳۔ بی جمالو، اسلوب بیان اور، اردو مجلس، حیدر آباد، ۲۰۰۹ء، ص ۳۵

اس کی ٹوپی اس کے سر رکھنا محاورے ہیں۔

زینت ساجدہ اپنے انشائیوں میں اقوال اور فقروں کے استعمال سے بھی نہ چوکیں۔انہوں نے موقع ومحل کے اعتبار سے اقوال اور فقروں کو استعمال میں لایا ہے۔مثال کے طور پر انشائیہ ''مکان بناڈالا'' کا ایک اقتباس پیش ہے جس میں انہوں نے مکان بنانے کے تجربات کو تلسی داس کے قول کے حوالے سے پیش کیا ہے:

> ''مگر جو کہتے ہیں نا قسمت کا لکھا پورا ہو کر رہتا ہے۔تلسی داس کہے گئے ہیں کر من گت تاڑے نا ہیں ٹرے سو ہماری قسمت میں یہی لکھا تھا کہ یہ دردسر مولا اور وہ جو دوسروں سے عبرت حاصل کرتے تھے اوروں کے لئے درس عبرت بن جائیں۔اوروں کو اپنی کہانی رو رو کر سنائیں اور ہمدردی کے طلب گار ہوں۔عاقل ودانا ہم پر ہنسیں،انگلیاں اٹھائیں اور فقرہ کسیں۔ہم نہ کہتے تھے بچہ اس جنجال میں نہ پڑنا خود مصیبت میں پڑھو گے اور لوگ سمجھیں گے راحت ملی۔
>
> ماکھی گڑ میں گری رہی پنکھ رہے لپٹائی
>
> تالی پیٹے سر دھنے پھولے نا ہیں سماتی۔'' [1]

زینت ساجدہ نے اپنے انشائیوں کو تشبیہات و استعارات سے ایک نیا رنگ دیا ہے۔ان کے اسلوب میں تشبیہات و استعارات کی دلکشی اور زبان میں سادگی قاری کو متاثر کرتی ہے۔مثال کے طور پر انشائیہ ''گنڈی پیٹ کا پانی'' سے ایک اقتباس ملاحظہ ہو جس میں انہوں نے دلچسپ تشبیہات کا استعمال کیا ہے۔مثال دیکھیے:

> ''عام طور پر غیر ملکیوں کو فائدہ کرتا ہے، بلکہ ان کے لئے اکسیر کا حکم رکھتا ہے۔گھاٹ گھاٹ کا پانی پی چکنے بعد دور دور سے لوگ اس کو پینے کے لئے حیدرآباد آتے رہے ہیں اور آج بھی آتے ہیں۔پھر بھی یاد رہے گی اس کی خاصیت نیلم اور پکھراج کی طرح ہے راس نہیں تو ناس کرنے والا۔'' [2]

[1] مکان بناڈالا،اسلوب بیان اور،اردو مجلس،حیدرآباد،۲۰۰۹ء،ص ۳۶

[2] گنڈی پیٹ کا پانی،اسلوب بیان اور،اردو مجلس،حیدرآباد،۲۰۰۹ء،ص ۵۵

مذکورہ بالا اقتباس میں انشائیہ نگار نے گنڈی پیٹ کے پانی کی اہمیت کو بیان کرتے ہوئے اس کی تشبیہ نیلم اور پکھراج سے کی ہے۔ان کے ایک اور انشائیہ ''ہم ہیں تو ابھی راہ میں ہیں سنگِ گراں اور''میں بھی تشبیہات کا حسین استعمال ہوا ہے۔اقتباس پیش ہے:

''یہی وجہ ہے عورت نبی کو پیدا کرتی ہے،خود نبی بننے کا دعوی نہیں کرتی۔سیتا کی طرح بن باس لیتی ہے۔زینب کی طرح کربلا کے تیر اپنے سینے میں چھپا لیتی ہے۔میرا کی طرح ادھورے گیت گنگناتی ہے۔قرۃالعین کی طرح پھانسی پر چڑھ جاتی ہے۔پھر بھی کامل نہیں بن سکتی۔'' ۱؎

اس اقتباس میں انشائیہ نگار نے عورت کے صبر وتحمل اور ہمت کو سیتا،میرا اور قرۃالعین کے مشابہ قرار دیا ہے جس کی بدولت اسلوب میں ایک حسین دلکشی پیدا ہوتی ہے۔اسی انشائیہ کا ایک اور اقتباس دیکھئے:

''بیچاری عورت کے پاس اس کی اپنی کوئی چیز تو ہوتی نہیں اس لئے وہ کچھ بھی نہیں بن سکی۔جو کچھ بھی اس کا ہے سب دوسروں کا ہے یا دوسروں کے لئے ہے اس کے سارے وجود پر ہمیشہ دوسروں کا حق ہوتا ہے اس کا حق اپنے پر بھی نہیں جیسے قرض خواہ تنخواہ آئی اور بٹ گئی نفع کم نقصان زیادہ۔'' ۲؎

اس انشائیہ میں عورت کے جذبات واحساسات کی بھرپور عکاسی کی گئی ہے اور انشائیہ نگار نے مذکورہ بالا اقتباس کے حوالے سے عورت کی قربانیوں کا ذکر کرتے ہوئے اس کی زندگی کو قرض خواہ کی تنخواہ سے تشبیہ دی ہے گویا عورت اپنی خواہشات کے مطابق زندگی نہیں گذارتی بلکہ وہ اپنی ساری خواہشات اور امنگیں دوسروں کے لئے قربان کر دیتی ہے۔

انشائیہ'' کاہ کروسنگھار پیا مورا اندھا''میں انشائیہ نگار نے اپنے شوہر کی تعریف کرتے ہوئے تشبیہ سے کام لیا ہے۔مثال کے طور پر اقتباس دیکھئے۔

۱؎ ہم ہیں تو ابھی راہ میں ہیں سنگ گراں اور،اسلوب بیان اور،اردو مجلس،حیدرآباد،۲۰۰۹ء،ص ۳۱

۲؎ ہم ہیں تو ابھی راہ میں ہیں سنگ گراں اور،اسلوب بیان اور،اردو مجلس،حیدرآباد،۲۰۰۹ء،ص ۲۷

''خدانخواستہ اندھا کیوں ہونے لگا۔اچھی خاصی بڑی بڑی آنکھیں ہیں۔کوئی کہتا ہے ہرن جیسی دل موہ لینے والی اور کوئی کہتا ہے گائے جیسی بھولی بھالی۔بینائی میں بھی ایسی کوئی ضرابی بھی نہیں ہے۔پرانی پرانی کتابوں کے گنجلک خط آسانی سے پڑھ لیتے ہیں باریک سے باریک لکھائی دن رات گھورتے رہتے ہیں پھر بھی کوئی تکلیف نہیں ہوتی۔'' ۱؎

انشائیہ ''اگر اللہ میاں عورت ہوتے'' میں زینت ساجدہ نے استعارہ کا استعمال کرتے ہوئے فلسفہ تانیثیت کے تصور کو اجاگر کیا ہے۔انہوں نے عورت کے جذبات کی عکاسی کی ہے اوراور استعاراتی پیرایہ کی مدد سے مرد کے رویوں کو بیان کیا ہے۔مثال کے طورا قتباس پیش ہے:

''مرد میں وحشت اور درندگی زیادہ ہوتی ہے۔وہ بچپن سے لے کر بوڑھا ہونے تک حیوان بنا رہتا ہے۔جذبات کا احترام جانتا ہی نہیں۔یہ دنیا صرف حیوانوں کا مسکن ہوتی اگر عورت مرد کی فطرت کو نہ سدھارتی۔اس کے ساتھ ساتھ رہتے رہتے ہوئے عورت میں بھی کچھ درستی پیدا ہوگئی ہے۔'' ۲؎

مذکورہ اقتباس میں انشائیہ نگار نے مرد کے منفی کردار کو بیان کرتے ہوئے اس کو حیوان صفت قرار دیا ہے۔مرد کو سدھارنے اور ہدایت پر لانے کا سہرا عورت کو ہی جاتا ہے۔ان کے ایک اور انشائیہ ''دیکھا دیکھی'' میں بھی انہوں نے استعارہ کا استعمال کرتے ہوئے سماج کی ایک تصویر کو بڑے ہی مزاحیہ انداز میں بیان کیا ہے۔مثال کے طور پر اقتباس پیش ہے:

''مگر کبھی کبھی ایسے نمونے بھی دکھائی دیتے ہیں کہ بے ہوش ہونے کو جی چاہتا ہے۔چناں چہ میں نے بھی دیکھا ہے اور آپ نے بھی دیکھا ہوگا کہ کوئی ٹھگنی،موٹی اور کالی مسز فیشن شوخ رنگ کے کپڑوں اور کٹے ہوئے بالوں میں ایک ساتھ اجنتا اور پیرس کا چلتا پھرتا اشتہار نظر آتی ہے اور پبلک اس کارٹون کو

۱؎ کاہ کروں کروں سنگھار پیا مورا اندھا،اسلوب بیان اور،اردو مجلس،حیدرآباد،۲۰۰۹ء،ص ۶۳

۲؎ اگر اللہ میاں عورت ہوتے،اسلوب بیان اور،اردو مجلس،حیدرآباد،۲۰۰۹ء،ص ۲۳

دیکھ کر خودکشی کے بارے میں سنجیدگی سے غور کرنے لگتی ہے۔'' ۱؎

زینت ساجدہ نے انشائیوں میں ضرب المثل کا استعمال بھی بڑی ہی خوبصورتی کے ساتھ کیا ہے۔اس کے استعمال سے ان کی تحریر میں روانی اور مسرت پیدا ہوتی ہے جو ان کے اسلوب کو بہتر اور منفرد بناتی ہے۔مثال کے طور پر ان کے انشائیہ ''کباڑ خانے سے میوزیم تک'' سے ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

''مگر ٹھیریے،آپ منہ کھولے ہمیں کہاں تک رہے ہیں،یہی سوچ رہے ہیں نا کہ یہ الہام ہم کو کب اور کیسے ہوا کہ ہم مرغی خانہ سے جست کر کے اچانک میوزیم پہنچ گئے۔تو ساری داستان امیر حمزہ سنائے دیتے ہیں۔'' ۲؎

اسی سلسلے میں ایک اور انشائیہ ''بی جمالو'' کا ایک اقتباس پیش ہے جو ان کی ضرب المثل کے استعمال پر مہارت کا ثبوت پیش کرتا ہے:

''کس کس پر جمالو نے ہاتھ صاف نہیں کیا۔دنیا بھر کی لڑائیاں، قصے کہانیاں، دنگے فساد انہیں کے دم سے ہیں۔کہیں ہیلن آف ٹرائے کا فتنہ،کہیں شیریں فرہاد کا ہنگامہ،کہیں ہیر رانجھا کا جھگڑا،کہیں قرۃ العین کا قصہ غرض ہر دور، ہر ملک اور ہر قوم میں کوئی نہ کوئی قیامت صغریٰ کھڑی کر دی اور آپ دامن بچا کے صاف نکل آئیں۔کوئی دیوانہ ہو کر بھٹکتا پھرے تو انہیں کیا۔کسی نے سر پھوڑ لیا اس کی بے وقوفی،کسی کو بن باس ملا تو کیا انہوں نے دلوایا۔'' ۳؎

مندرجہ بالا اقتباس میں انشائیہ نگار نے ایک خیالی کردار بی جمالو کے ذریعے سماج میں موجود ایسی صفات والی عورتوں کو مختلف ضرب المثال کا استعمال کرتے ہوئے ان کی عادات و اطوار کی عکاسی کی ہے۔ایک اور انشائیہ ''دیکھا دیکھی'' میں بھی انہوں نے ضرب المثل کا استعمال کرتے ہوئے معاشرہ میں نقل کرنے کی روایت کو مزاحیہ انداز میں پیش کیا ہے۔اقتباس پیش ہے:

''لیکن ہے یہ بڑی دلچسپ بات۔ایک واسکوڈی گاما کیا سیر وسیاحت کے لئے

۱؎ دیکھا دیکھی،اسلوب بیان اور،اردو مجلس،حیدرآباد،۲۰۰۹ء،ص ۷۷

۲؎ کباڑ خانے سے میوزیم تک،اسلوب بیان اور،اردو مجلس،حیدرآباد،۲۰۰۹ء،ص ۹۰

۳؎ بی جمالو،اسلوب بیان اور،اردو مجلس،حیدرآباد،۲۰۰۹ء،ص ۴۰

نکلا، بہت سوں کو یہی شوق چڑایا، ایک کولمبس امریکا پہنچا تو سارے یورپ والے اس کے پیچھے دوڑ پڑے۔ بہرحال ان گنت صدیوں سے یہی سلسلہ چل رہا ہے۔ دنیا کا کوئی گوشہ ایسا نہیں، جہاں نئی بات ہوئی اور پھر وہ عام ہو کر پورانی نہ پڑ گئی ہو۔''[1]

زینت ساجدہ کے دیگر انشائیوں میں بھی تشبیہات و استعارات، محاورے اور ضرب المثل کا استعمال بخوبی ملتا ہے جو ان کی زبان و بیان پر مہارت کو ظاہر کرتا ہے۔ انہوں نے اس کے استعمال میں بہت ہی چابکدستی اور احتیاط سے کام لیا ہے اور موقع محل کی مناسبت سے اس کو انشائیوں میں جگہ دی ہے۔

زینت ساجدہ کے انشائیوں میں جگہ جگہ انگریزی کے الفاظ بھی نظر آتے ہیں۔ انہوں نے انگریزی زبان کے الفاظ کو بہت ہی احتیاط کے ساتھ استعمال میں لیا ہے جو انشائیہ پڑھتے وقت قاری کو اجنبی نہیں محسوس ہوتے ہیں۔ ان کے انشائیوں میں پبلسٹی، آفیسر، بلیک مارکیٹنگ، الیکشن، کارٹون، مسز، فیشن، پبلک، وغیرہ انگریزی کے الفاظ موقع و محل کی مناسبت سے دکھائی دیتے ہیں۔

زینت ساجدہ کے انشائیوں کی زبان بہت ہی خوبصورت اور آسان ہے۔ وہ زبان کو حسین بنا کر پیش کرتی ہیں۔ زبان کی شگفتہ بیانی ان کے انشائیوں کی اہم خوبی ہے اور ان کے انشائیے شگفتہ اور پرُ لطیف انداز بیان سے پرُ نظر آتے ہیں۔ انہوں نے اپنے جزبات واحساسات اور تجربات و مشاہدات کو بہت ہی مؤثر انداز میں بیان کیا ہے۔ شگفتہ اور لطیف اسلوب کے ذریعے احساسات وہ جذبات کی کیفیات کی بہترین عکاسی کرتی ہیں۔ ان کی زبان میں روانی اور لہجے میں بے باکی ہے۔ انہوں نے دلچسپ تشبیہات، اشتعارات، محاروں اور ضرب المثال کے ذریعے اپنے انداز بیان کو موثر بنانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی ہے۔ غرض ان کے انشائیے زبان و بیان پر ان کی دسترس کے شاہد ہیں۔

---

[1] دیکھا دیکھی، اسلوب بیان اور، اردو مجلس، حیدر آباد، ۲۰۰۹ء، ص ۶۷

مجموعی جائزہ

زینت ساجدہ حیدرآباد کی خواتین ادیبوں میں ایک منفرد مقام رکھتی ہیں۔انہوں نے افسانے، خاکے، انشائیے، مزاحیہ مضامین اور تحقیقی وتنقیدی مضامین بھی لکھے ہیں۔لیکن بنیادی طور پر ان کو ایک افسانہ نگار اور انشائیہ نگار کی حیثیت سے شہرت ومقبولیت حاصل ہوئی۔انہوں نے اپنے ادبی دور کا آغاز افسانہ نگاری سے کیا تھا۔ان کا پہلا افسانہ ''لاٹری'' ہے جو انہوں نے مضمون کی طرز پر لکھا ہے۔اس کے علاوہ انہوں نے کئی افسانے لکھے جو مختلف ادبی رسائل وجرائد میں شائع ہوتے رہے۔''جل ترنگ'' ان کا مشہور افسانوی مجموعہ ہے۔اس مجموعے میں کل دس (۱۰) افسانے شامل ہیں۔نوسر ہار اور کلیات شاہی زینت ساجدہ کے اہم تحقیقی وتنقیدی کارنامے ہیں۔خاکہ نگاری میں ''مخدوم محی الدین'' ان کا بہترین خاکہ ہے۔اس کے علاوہ انہوں نے انشائیہ نگاری میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔انہوں نے اپنا پہلا انشائیہ ''اگر میں مرد ہوتی'' لکھا جو اگست۔ستمبر ۱۹۴۵ء میں شائع ہوا۔ان کے انشائیوں کا مجموعہ ''اسلوب بیان اور'' کے عنوان سے ۲۰۰۹ء میں شائع ہوا۔اس مجموعے میں کل سترّہ (۱۷) انشائیے شامل ہیں۔مثلاً اگر اللہ میاں عورت ہوتے، بی جمالو، مکان بنا ڈالا، گنڈی پیٹ کا پانی، چار مینار پر غلاف، خالہ ماں سلام، دیکھا دیکھی، غیرہ۔زینت ساجدہ نے اپنی تحریر میں بے باکی کے ساتھ سماج کی فرسودہ روایات کی خرابیوں کو بے نقاب کیا ہے۔ان کی تحریر میں تاثر اور شگفتگی ہوتی ہے۔وہ انسانی نفسیات سے اچھی طرح واقف تھیں۔ان کے دلوں میں عورتوں کی بدحال زندگی کا پورا احساس تھا جو ان کی تحریروں میں بھی نظر آتا ہے۔ان کے خیالات کی پاکیزگی، بے باک طرز بیان، زبان کی سادگی اور شگفتگی، ان کو ادب کی دنیا میں ایک خاص مقام عطا کرتا ہے۔

زینت ساجدہ کی ولادت ۲۸رمئی ۱۹۲۴ء کو رائچور کرناٹک میں ہوئی۔ان کا پورا نام زینت النساء ساجدہ بانو ہے۔زمانے کی روایات اور رسم و رواج کے مطابق انہوں نے ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل

کی ۔اسکے بعد انہوں نے مدرسے کا رخ کیا اور ابتدائی جماعت سے لے کر ثانوی جماعت کی تعلیم مدرسہ تعلیم المعلّمات ، کاچی گوڑہ میں حاصل کی ۔۱۹۴۱ء میں انہوں نے میٹرک کا امتحان پاس کیا اس کے بعد ویمنس کالج سے ۱۹۴۳ء میں ایف ۔اے اور ۱۹۴۵ء میں بی ۔اے کا امتحان پاس کیا۔۱۹۴۷ء میں ایم ۔اے (اردو ادب) کی تعلیم انہوں نے آرٹس کالج ، عثمانیہ یونیورسٹی سے حاصل کی اور ۱۹۷۳ء میں انہوں نے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی ۔۱۹۴۷ء میں ایم ۔اے کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد بحیثیت اردو لیکچرر ملازمت اختیار کی ۔۱۹۸۶ء میں وہ بحیثیت ریڈر مقرر ہوئیں اور انہوں نے بحیثیت صدر شعبہ اردو بھی اپنی خدمات انجام دیا۔بحیثیت استاد انہوں نے نئی نسل کی تعمیر و تشکیل اور انسانی فلاح و بہبود میں کامیاب معلم کا کردار ادا کیا ہے۔انہوں نے ایک مثالی کردار ادا کرتے ہوئے طلبہ کے ساتھ نہایت شرافت ، نیک دلی اور شفقت کا مظاہرہ کیا ہے۔انہوں نے طلبہ کے ساتھ خوشگوار تدریسی فضا قائم کرتے ہوئے ان کے اندر تخلیقی فکر پیدا کرنے کی کوشش کی ۔اس سلسلے میں مجاور حسین لکھتے ہیں:

> ’’انہوں نے 33 برس کی تدریسی زندگی کو ایک روشن کتاب کی طرح نمونہ عمل بنا کر پیش کیا۔مشرقی تہذیب کے اعلیٰ ترین معیار کو اپنا کر انہوں نے شرافت ، نیک نفسی ، بے نیازی اپنی شفقتوں سے طالب علموں کی حوصلہ افزائی کر کے ان کی زندگیاں سنواری ہیں ۔عام طور پر استاد کے سامنے کچھ لکھ کر لے جائیے تو سننا پڑتا ہے: غلط یہ لفظ ، وہ بندش بری ، یہ مضمون سست ، مگر ڈاکٹر زینت ساجدہ کے پاس لے جائیے تو صحیح یہ لفظ ، یہ بندش درست ، یہ مضمون چست ، سننے کو ملے گا۔وہ حوصلہ افزائی فرماتی ہیں ۔دل بڑھاتی ہیں ۔ذرہ کو آفتاب کا ہم پایہ بنا دیتی ہیں ۔حوصلہ افزائی ان کے کردار کا اہم ترین جزو ہے۔‘‘ [۱]

زینت ساجدہ کے انشائیوں کے مطالعے کے بعد جو بات سمجھ میں آتی ہے وہ یہی ہے کہ انہوں نے انشائیہ کی فنی خصوصیات کو نظر میں رکھتے ہوئے اپنے انشائیوں کو دلچسپ بنانے کی پوری کوشش کی ہے۔وہ انشائیہ کو اختصار سے پیش کرنے کے ہنر سے خوب واقف ہیں ۔وہ ہر شے پر گہری نگاہ رکھتی ہیں وہ

۱۔ ڈاکٹر مجاور حسین ، جب تک چار مینار ہاتھ اٹھائے مصروف دعا رہے ، پونم (زینت ساجدہ نمبر) ، حیدر آباد ، جون ۔جولائی ۱۹۸۳ء ، ص ۳۹

موضوع پر اظہار خیال کرتے وقت بے باکانہ انداز اختیار کرتے ہوئے اس کا پورا حق ادا کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔اختصار اور جامعیت ان کے انشائیوں میں بجا طور پر نظر آتا ہے۔

انشائیہ کے اجزا میں غیر رسمی انداز بیان اہم جز ہے۔یعنی انشائیہ نگار غیر رسمی انداز بیان اختیار کرتے ہوئے اپنے موضوع سے بار بار انحراف کرنے لگتا ہے۔زینت ساجدہ بھی اپنے انشائیوں میں موضوع سے انحراف کرتے ہوئے زندگی کے تجربات و مشاہدات کو بہت ہی لطیف اور انوکھے انداز میں بیان کرتی ہیں۔ان کا یہ فن کمال ہے کہ وہ عام سے عام اور غیر اہم باتوں کو بھی ایک نئے طریقے سے پیش کرتی ہیں اور ایک نئے زاویہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے آگے بڑھ جاتی ہیں جو قاری کو چونکا دینے والا ہوتا ہے۔وہ بات سے بات پیدا کرتے ہوئے قاری کو اپنے اعتماد میں لینے کی کوشش کرتی ہیں اور اس تکنیک میں وہ کامیاب بھی نظر آتی ہیں۔

زینت ساجدہ اپنے سماجی مشاہدات و تجربات کو اپنے موضوع کے تحت سمیٹنے کی کوشش کرتی ہیں اور قاری کو اس موضوع کی طرف غور و فکر کے لئے ایک نیا زاویہ بھی فراہم کرتی ہیں جو انشائیہ کی اہم صفت تسلیم کیا جاتا ہے۔بات سے بات پیدا کرنے کے فن پر انہیں خوب مہارت حاصل ہے اور اسی فن کی بناء پر ان کے انشائیہ میں بے ترتیبی رونما ہوتی ہے لیکن یہ بے ترتیبی قاری کو گراں نہیں گزرتی بلکہ لطف و مسرت کا ذریعہ بنتی ہے۔

زینت ساجدہ اپنے انشائیوں میں تجربات و مشاہدات کو بیان کرتے وقت موضوع کے حوالے سے بہت ساری ایسی ضمنی باتیں بھی کہہ جاتی ہیں جس میں استدلال کی کمی ہوتی ہے اور دماغ قبول کرنے پر آمادہ نہیں ہوتا ہے لیکن یہ بے عقلی اور غیر منطقی باتیں قاری کو اکتاہٹ نہیں محسوس ہونے دیتی ہیں اور اسی بنیاد پر وہ قاری کو اپنے احباب میں شامل کرتی ہوئی نظر آتی ہیں۔غیر رسمی طریق کار کی یہ صفات ان کے انشائیوں میں جگہ جگہ موجود ہے۔

انشائیہ کے فن میں ایک ہم فن اسلوب کی شگفتگی ہے۔جو انشائیہ نگار سے غیر رسمی انداز بیان پر منحصر ہوتی ہے۔انشائیہ نگار اس فن کی بنا پر قاری کو متاثر کرنے کی کوشش کرتا ہے۔زینت ساجدہ نے اپنے

انشائیوں میں اسلوب حسن اور شگفتگی کا دامن نہیں چھوڑا بلکہ اپنی تحریر میں سادہ اور عام فہم اسلوب اختیار کرتے ہوئے عام اور غیر سنجیدہ باتوں کو بڑے ہی انوکھے انداز میں بیان کیا ہے۔ان کے اسلوب میں فلسفیانہ شگفتگی کا احساس ہوتا ہے۔ان کے انشائیے احساس تازگی اور دلنشینی سے پر ہیں۔چیزوں کو نئے زاویے سے دیکھنے کا ان کا فن قاری کی دلچسپی میں اضافہ کرتا ہے اوران کوغور وفکر پر آمادہ کرتا ہے جس سے ان کے انشائیوں میں تازگی برقرار رہتی ہے۔ان کے اسلوب میں مسرت ولطف اندوزی اور نشاط آفرینی موجود ہے۔ان کے اسلوبِ بیان کے سلسلے میں مرزا ظفرالحسن لکھتے ہیں:

> ''صحیح زبان لکھ لینا کوئی کمال نہیں ہے۔کمال تو یہ ہے کہ قاری زبان کی وجہ سے بھی کسی تخلیق کے مطالعہ کی طرف مائل ہو۔اس لحاظ سے زینت ایک باکمال قلمکار ہیں۔صاف ستھری اور سادہ زبان لکھتی ہیں اور اُسی روانی اور شگفتگی کے ساتھ جس سے کہ وہ تقریر کرتی ہیں۔جملوں میں نہ آرائشی تراکیب اور نہ چربی چڑھے ہوئے موٹے موٹے الفاظ ملتے ہیں۔جن سے مفہوم خبط اور قاری خبطی ہوجاتا ہے۔''[1]

زینت ساجدہ کے انشائیوں کے مطالعہ کے بعد قاری کو انشائیہ کے عدم تکمیل کا احساس بھی ہوتا ہے۔ان کے مختلف انشائیے اس صفت سے آراستہ نظر آتے ہیں۔انشائیہ کے اختتام پر قاری کو ایک نیا اور غیر رسمی سازاویہ بھی مل جاتا ہے جو اس کے ذہن کوغور وفکر کی طرف راغب کرتا ہے اور زندگی کے ان پوشیدہ حقائق کو قاری بصیرت کی نظر سے دیکھنے کی کوشش کرتا ہے۔اگر اللہ میاں عورت ہوتے، میں نے نوکری کی، کباڑ خانے سے میوزیم تک، میری مرغیاں، گنڈی پیٹ کا پانی، وغیرہ اسی طرح کے انشائیے ہیں جو اختتام پر قاری کو اپنے نامکمل ہونے کا احساس دلاتے ہیں اور غور وفکر کی ایک نئی راہ چھوڑ جاتے ہیں۔

انشائیہ میں انکشاف ذات اور شخصی نقطہ نظر کو خصوصی اہمیت حاصل ہے۔انکشاف ذات انشائیہ کا ایک ایسا جز ہے جس سے انشائیہ کے دیگر اجزاء کی گہری وابستگی ہوتی ہے۔زینت ساجدہ کے انشائیوں میں ان کی شخصیت کے کئی پہلو منکشف ہوتے نظر آتے ہیں۔وہ اپنے انشائیوں میں زندگی کے واقعات اور

[1] مرزا ظفرالحسن، پیش لفظ، اسلوب بیان اور، حیدرآباد، ۲۰۰۹ء ص ۸

معاملات کو ایک نئے رنگ میں ڈھال کر ایک نئی صورت میں پیش کرتی ہیں جس میں وہ اپنی ذات کے حوالے سے زندگی کے حقائق کو ایک منفرد نقطہ نظر سے پیش کرتی ہیں جس کی بدولت انشائیہ میں ان کی شخصی مرکوزیت قائم رہتی ہے۔وہ مشاہدہ ذات کے ذریعے ہی مشاہدہ کائنات کو دیکھنے کا عمل انجام دیتی ہیں اورانہوں نے اپنی ذات کے ذریعے ہی کائنات کو نئے طریقے سے سمجھنے کی کوشش کی ہے۔زینت ساجدہ کے انشائیوں میں ان کی شخصیت کہیں کہیں براہ راست طور پر اور کہیں کہیں بالواسطہ طور پر اثر انداز ہوتی ہے۔ان کی شخصیت کا یہ ظہور قاری کو احساس ہوئے بغیر ان کے انشائیوں کی تحریر میں داخل ہوتا ہے جو زینت ساجدہ کی فنی مہارت کا ثبوت پیش کرتا ہے۔

زینت ساجدہ کے انشائیوں میں شخصیت کے متضاد عناصر بھی نظر آتے ہیں۔انہوں نے اپنی شخصیت کے ان پہلوؤں کو شعوری یا غیر شعوری طور پر انشائیوں میں بیان کیا ہے جس سے ان کا کردار نمایاں طور پر نظر آتا ہے۔اپنی شخصیت کے ظہور میں انہوں نے اپنی خامیوں اور کمزوریوں کو ابھارنے کی کوشش کی ہے اور اس کو موضوع بناتے ہوئے آزادانہ طور پر بہت ساری ضمنی باتیں بھی بیان کر جاتی ہیں جو ان کی شخصیت کو نمایاں کرتی ہیں۔انکشاف ذات کے حوالے سے ان کے انشائیوں میں ''میں'' کا تصور بھی موجود ہے،انہوں نے اس طریق کار کو بیان کرنے میں ایجاز و اختصار سے کام لیا ہے اور فنکارانہ توازن کو برقرار رکھا ہے۔ انشائیہ میں اظہار ذات کا معاملہ مشکل اور نازک ہوتا ہے اور اس کی کامیابی انشائیہ نگار کی ہنرمندی پر منحصر ہوتی ہے۔زینت ساجدہ نے اس فن کے استعمال میں چابکدستی سے کام لیا ہے۔

انشائیے میں غیر رسمی انداز بیان کی اہمیت ہوتی ہے۔زینت ساجدہ نے اپنے موضوع کو عنوانات سے بہت حد تک ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی ہے لیکن کہیں کہیں ان کے عنوانات موضوع یا نقطہ نظر سے مختلف نظر آتے ہیں چونکہ انشائیہ میں انشائیہ نگار غیر رسمی طریقہ اختیار کرتے ہوئے ہیں موضوع کے حوالے سے بہت ساری ضمنی باتیں بیان کرتا ہے جس کی بدولت اسے نقطہ نظر سے منحرف ہونا پڑتا ہے۔زینت ساجدہ نے بھی اس فن کو اپناتے ہوئے موضوع کے حوالے سے اپنے جذبات واحساسات اور تجربات و مشاہدات کو بیان کیا ہے جن کا انشائیہ کے موضوع سے تعلق نظر نہیں آتا لیکن ان میں ایک شعوری ربط ہے جو

قاری کی دلچسپی کو ضائع نہیں ہونے دیتا۔

انشائیے کے موضوع کے تعلق سے یہ ظاہر ہے کہ انشائیہ نگار موضوع کے انتخاب کے لئے آزاد ہوتا ہے۔ وہ اپنے عہد کے اعمال و افعال سیاسی وسماجی سرگرمیوں اور تہذیبی و معاشرتی تبدیلیوں پر ایک حساس نظر رکھتا ہے اور زندگی کے تمام تر واقعات اور معاملات کو نئے نئے زاویے سے منظر عام پر لاتا ہے۔ غرض کہ وہ زندگی کے ہر پہلو کو ایک انوکھے انداز میں بیان کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ زینت ساجدہ نے اپنے موضوع کے تحت زندگی کے مختلف پہلوؤں کا احاطہ کیا ہے اور موضوع کا سہارا لیتے ہوئے اپنے احساسات و جذبات اور مشاہدات و تجربات کو بڑے ہیں سلیقے سے شگفتہ اور لطیف انداز میں پیش کیا ہے۔ زینت ساجدہ کی اپنے عہد کے سیاسی وسماجی حالات پر گہری نظر تھی انہوں نے زمانے کے حرکات و سکنات کا بڑی گہرائی کے ساتھ مشاہدہ کیا ہے جوان کے انشائیوں میں صاف طور پر نظر آتا ہے۔ غرض انہوں نے اپنے انشائیوں کے لئے ہر طرح کے موضوعات کا انتخاب کیا اور عام سے عام اور چھوٹی سے چھوٹی باتوں کو اپنے موضوع کے تحت سمیٹا ہے۔

طنز و مزاح انشائیہ کا لازمی جز نہیں ہے۔ لیکن انشائیہ میں اس کی شمولیت سے انکار بھی نہیں کیا جاسکتا ہے کیوں کہ طنز و مزاح کو انشائیہ نگار متوازن مقدار میں ایک معاون قوت کے طور پر ہی استعمال کرتا ہے۔ زینت ساجدہ کے انشائیوں میں جگہ جگہ طنز و مزاح نظر آتا ہے۔ انہوں نے جارحانہ اور شدید قسم کے طنز مزاح سے پرہیز کیا ہے بلکہ ہلکے پھلکے طنز و مزاح کا سہارا لیتے ہوئے اپنے اسلوب کو انفرادیت عطا کی ہے۔ انہوں نے طنز و مزاح کو بے تکلف اور دوستانہ فضا میں اپنایا ہے جس کی بدولت وہ قاری کو اپنا شریک بنا لیتی ہیں۔ ان کے طنز و مزاح سے ہونٹوں پر مسکان اور خوشی کی لہر دوڑ جاتی ہے اور ذہن میں کشادگی کا احساس ہونے لگتا ہے۔ کبھی کبھی ان کا طنز و مزاح تلخی کا روپ بھی اختیار کر لیتا ہے۔ ان کے منفرد اسلوب میں تمثیل، تشبیہ و استعارے کے برملا استعمال کے علاوہ زبان کی شوخی کے ساتھ فلسفیانہ انداز بھی شامل ہے۔

زینت ساجدہ کے انشائیہ زبان و بیان کی سطح پر فنکاری اور تخلیقیت کا ثبوت مہیا کرتے ہیں۔ ان

کے انشائیوں کی زبان میں شوخی ،سنجیدگی، تفکر اور تخیل، ایجاز واختصار غرض تمام خصوصیات موجود ہیں۔انہوں نے اپنے فنکارانہ انداز بیان کی بدولت اپنے انشائیوں کو آسان اور دلچسپ بنانے کی کوشش کی ہے۔

زینت ساجدہ کو زبان و بیان پر قدرت حاصل ہے۔ان کی تحریر میں روانی اور زبان صاف شفاف اور چست ہے۔انہوں نے اپنی تحریروں میں حسب ضرورت محاوروں اور کہاوتوں کا استعمال کیا ہے۔ بہت ساری سطروں میں ضرب المثل کے استعمال سے بھی انشائیوں کو زینت عطا کی ہے۔زینت ساجدہ کی کہاوتوں اوراستعمال کے فن پر تبصرہ کرتے ہوئے''اسلوب بیان اور'' کے''پیش لفظ'' میں ظفرالحسن نے اپنی رائے کا اظہار یوں کیا ہے:

> ''زینت سے میری ایک فرمائش بھی ہے ان کے انشائیے' خالہ ماں سلام' میں قول نقل ہے کہ ''اچھے اچھے پھول اللہ میاں کی درگاہ پر، خراب خراب پھول بلی کے چونڈے میں'' میں نے یہ کہاوت آج تک نہیں سنی اور بہت پسند آئی۔ دوسرے انشائیوں میں بھی کہاوتیں جیسے ''دیکھا دیکھی چولہا پھونکی'' بہت سی کہاوتیں اور اقوال ایسے ہوتے ہیں جن کے پس منظر میں کوئی نہ کوئی ثقافتی یا کوئی تلمیح ضرور ملے گی میرے خیال میں اس سرمایہ کو محفوظ کر لینا چاہیے۔''[1]

زینت ساجدہ کے انشائیوں میں تشبیہات و استعارات، ضرب المثل اور محاورے کا برمحل اور خوبصورت استعمال ان کے اسلوب میں دلکشی اور لطافت پیدا کرتا ہے۔وہ موقع ومحل کے اعتبار سے فقروں اور اقوال کا استعمال بھی بجا طور پر کرتی ہیں۔

زینت ساجدہ کے انشائیوں میں جگہ جگہ انگریزی کے الفاظ بھی نظر آتے ہیں۔انہوں نے انگریزی زبان کے الفاظ کے استعمال میں بہت ہی احتیاط سے کام لیا ہے اور ان الفاظ کا انتخاب کیا ہے جو انشائیہ پڑھتے وقت قاری کو اجنبی محسوس نہیں ہوتے ہیں۔غرض زینت ساجدہ کے انشائیوں کی زبان خوبصورت اور آسان ہے۔شگفتہ بیانی ان کے انشائیوں کی ایک اہم خوبی ہے۔ان کے انشائیے زبان و

[1] مرزا ظفرالحسن، پیش لفظ، اسلوب بیان اور، حیدرآباد، ۲۰۰۹۔ص ۱۰

بیان پران کی دسترس کے شاہد ہیں۔

زینت ساجدہ کے انشائیوں کے مجموعی جائزہ کی روشنی میں یہی نتیجہ سامنے آتا ہے کہ وہ اپنے عہد کے ادیبوں سے مختلف راہ اختیار کرتے ہوئے ایک منفرد اسلوب کو اپنایا ہے۔انہوں نے شگفتہ اسلوب، لطافت اور تازگی سے اپنے انشائیوں کو موثر اور کامیاب بنایا ہے۔انہوں نے مختلف موضوعات پر انوکھے انداز میں اپنے جذبات واحساسات اور تجربات ومشاہدات کی عکاسی کی ہے۔زندگی کے پوشیدہ حقائق کو نئے زاویے کے ساتھ قاری کی نذر کیا ہے۔ان کے انشائیے اختصار اور جامعیت سے پر ہیں۔تازگی اور شگفتگی ان کے اسلوب کی خاص خصوصیت ہے۔انہوں نے مشکل زبان کے استعمال سے پرہیز کیا ہے اور عام بول چال کی زبان کو انشائیوں میں جگہ دی ہے۔غرض ان کو اسلوب کی انفرادیت اور انشائیہ کے فن پر مکمل قدرت حاصل ہے۔انشائیہ کے فن پر عبور ہونے کی بدولت انہیں اردو ادب میں ایک اہم مقام حاصل ہے اور بلاشبہ زینت ساجدہ عصر حاضر کے انشائیہ نگاروں میں نمایاں حیثیت کی حامل ہیں۔

کتابیات

کتابیات

نمبر شمار	مصنف کا نام	کتاب کا نام	مقام اشاعت	سن اشاعت
1-	ڈاکٹر احمد امتیاز	انشائیہ کے فنی سروکار	ایم۔آر پبلی کیشنز، دہلی	۲۰۱۲
2-	ڈاکٹر آدم شیخ	انشائیہ	رائٹرس امپوریم پرائیویٹ لمیٹیڈ، ممبئی،	۱۹۶۵ء
3-	ڈاکٹر آمنہ تحسین	تانیثی فکر کی جہات	عفیف آفسیٹ پرنٹرس دہلی	۲۰۱۲ء
4-	ڈاکٹر آمنہ تحسین	حیدرآباد میں اردو کا نسائی ادب	روشان پرنٹرس، دہلی،	۲۰۱۷ء
5-	ڈاکٹر آمنہ تحسین	حیدرآباد میں اردو ادب کی تحقیق	ایجوکیشنل ہاؤس پبلشنگ، دہلی	۲۰۱۰ء
6-	ڈاکٹر زینت ساجدہ	اسلوب بیان اور	اردو مجلس، حیدرآباد	۲۰۰۹ء
7-	ڈاکٹر سلیم اختر	انشائیہ کی بنیاد	عفیف پرنٹرس، دہلی	۲۰۱۴ء
8-	ڈاکٹر سید محمد حسنین	صنف انشائیہ اور چند انشائیے	ایوان اردو، پٹنہ	۱۹۶۳ء
9-	سید صفی مرتضیٰ	اردو انشائیہ	نسیم بک ڈپو، لکھنو	۱۹۶۱ء
10-	ڈاکٹر مسز عسکری صفدر	دکنی ادب کے محققین و محسنین	عفیف آفسیٹ پرنٹرس، دہلی	۲۰۱۱ء
11-	ڈاکٹر وزیر آغا	انشائیہ کے خدوخال	لبرٹی آرٹس پریس، دہلی	۱۹۹۱ء
12-	ڈاکٹر وزیر آغا	دوسرا کنارہ	سیمانت پرکاشن، دہلی	۱۹۸۵ء
13-	محمد اسد اللہ	یہ ہے انشائیہ	سلمان فائن آرٹس، ناگپور	۲۰۱۷ء
14-	یوسف سرمست	عرفان نظر	مینار بک ڈپو، حیدرآباد	۱۹۷۷ء

رسائل

1- پونم (زینت ساجدہ نمبر)، حیدرآباد، جون۔جولائی ۱۹۸۳ء